یاسمین حمید
دوسری زندگی

دوسری زندگی

دوسری زندگی

یاسمین حمید

دانیال

نام کتاب	:	دوسری زندگی
شاعر	:	یاسمین حمید
اہتمام	:	طارق شاہد
سرورق	:	جاوید قاضی، آصف شاہجہاں
اشاعت اوّل	:	2007
تعداد اشاعت	:	ایک ہزار
ناشر	:	مکتبۂ دانیال، وکٹوریہ چیمبر ۲، عبداللہ ہارون روڈ، کراچی
طابع	:	پرنٹ اسٹائل، اسلام آباد
قیمت	:	سات سو پچاس روپے

ISBN:969-419-026-6

Doosri Zindagi

Poetry

Yasmeen Hameed

Published by

Maktaba-e-Danyal

Price: Rs.750/- US $ 20

انتساب

سلمان اور عیشہ کے بیٹے
ابراھیم کے لئے

ترتیب

فنا بھی ایک سراب

(۲۰۰۱)

انتساب

زینب کے لیے

فہرست

نظمیں

غزلیں

نثری نظمیں

آپؐ تو جانتے ہیں سب ارض و سما کے نکتہ داں
اذنِ سوال دیجیئے پھر سے بلایئے وہاں

جیسے کسی دُعا کے ساتھ دل کی فضا بدل گئی
راہ سمندروں نے دی کھُلنے لگے ہیں بادباں

کیسی عجیب بات ہے سنتے رہے وہ دیر تک
اتنے بڑے ہجوم میں صرف مری ہی داستاں

بابِ حرم پہ ہے کہیں لمس مرے بھی ہاتھ کا
فرشِ حرم پہ ہے کہیں میری جبیں کا بھی نشاں

رات پلٹ گئی وہیں صُبح ٹھہر گئی وہیں
گردشیں کیا سے کیا ہوئیں ایک دُعا کے درمیاں

ریزہ ریزہ جب بکھری ہُوں
ایک ہی رستے سے گزری ہُوں

تجھ کو اثاثہ سونپ کے اپنا
گہرے پانی میں اُتری ہُوں

سب کی حفاظت کرنے والے
میں دُنیا سے بہت ڈری ہُوں

جاننے والے حکمت والے
جانے کیوں غصّے سے بھری ہُوں

سچی باتیں سننے والے
میں کڑوی ہُوں اور کھری ہُوں

سب نے مجھے جس جُرم سے داغا
تو نے کہا میں اُس سے بَری ہُوں

سب نے مجھے زندہ دفنایا
تو نے کہا میں خوشخبری ہُوں

تو جس کا محبوب ہے آقاؐ
اُس خالق کی نقش گری ہُوں؟

پانی شاید اُتر رہا ہے
ڈُوب گئی تھی پھر اُبھری ہُوں

اک تسبیحِ درُود ہے لب پر
جس کے بیچ کہیں ٹھہری ہُوں
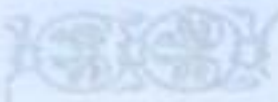
نظمیں

اک اور دن گزر گیا

سانس کا دھواں تمام کھڑکیوں پہ جم گیا
پھر ایک شہر گم ہوا
تماشا گاہِ روز و شب میں صرف میں ہوں
اور سنگ وخشت کا حصار ہے
لہولہان واہموں کی آہٹیں ہیں
چھپکلی سی رینگتی
سخن طراز عورتوں کا غول سرسرا رہا ہے
میری سمت بڑھ رہا ہے---
درد کی تپش سے دل کے روزنوں پہ لہلہاتی شاخِ گُل جھلس گئی
کسی کی معترض نگاہ اعتبار کی حدوں پہ رُک گئی
اور آج بھی یہی ہوا کہ

عہد نامۂ وفا کی سطرِ خاص
کاغذی تعلقات کے حساب میں لکھی گئی
کتابِ دل کا ایک اک ورق گواہ ہے
کتاب بے پڑھی ہی رہ گئی
صریرِ خامۂ سیاہ نے صدا بلند کی
تو سوچتی سماعتوں کا دائرہ سمٹ گیا
کسی کا نام دُوسرے کے نام سے جُدا ہوا
اور انتظار نے دلوں کی سرزمیں پہ اک لکیر کھینچ دی
ہواؤں نے سخن کیا
تو گھر کے سارے لوگ روشنی بُجھا کے سو گئے
اک اور دن گزر گیا!

PK 754

شہر جگمگا رہا ہے
اور کسی خفیف روشنی میں تم بھی سو رہے ہو
اِن بلندیوں سے
چاند کی زمیں قریب ہے،
مگر نہیں
ہَوا یہاں پہ تیز ہے کہ سرد ہے
کسی کو بھی خبر نہیں
یہ بادلوں کا تیرتا دھواں ہے
یا رفاقتوں کی گرد ہے
یہ کانپتی ہوئی صدائے واپسیں کی لہر ہے
کہ ڈولتا ہوا بدن اُڑان کا

کہ جھولتی ہوئی زمیں نشیب کی

وہ کون تھا جو مٹھیوں میں ریت بھر کے سو گیا
خیال و خواب سے بھی دور ہو گیا
بھٹکتی رات کے اُلجھتے گیسوؤں میں کھو گیا

ستارے میرے ساتھ چل رہے ہیں کیا
وہ کونسی خلش ہے جس کو مطمئن نہیں کیا
بلندیوں، جدائیوں نے
موت کے خیال نے بھی مطمئن نہیں کیا

بلندیوں کے،
پستیوں کے ہم سفر
بتاؤ تو
زمین پر
فضاؤں میں
جو راستہ نہیں بنا
وہ کیا ہوا،

بتاؤ تو

جو رات کی فصیل پار کر سکے
جو صبح میں بدل سکے
وہ کس طرح کی نیند ہے
وہ کس طرح کا خواب ہے
بتاؤ یہ فضا میں کیسی ہوک ہے
یہ کیسا اضطراب ہے
سفر کا اختتام ہو رہا ہے
اور شور بے حساب ہے

اس شام سے اُس صبح تک

میں سونا چاہتی ہوں
دیر تک
اِس شام سے
اُس صبح تک
جس کو ابھی تخلیق ہونا ہے

بہت کڑوا ہے میری نیند کا ہر گھونٹ
رنگیں گولیوں جیسا
سدا بے خواب
بے آواز
بے دستک

تہوں پہ تہہ بچھاتا
رات کا گہرا سمندر
پار کرتی نیند کو معلوم کب ہوگا
اندھیرے ڈوبنے والے نہیں ہیں
رات کی منزل میں جو آنکھیں کھلیں تو
سر کے اندر رینگتے کیڑے
کسی جانب بھلا کب دیکھنے دیں گے
کہیں آنکھوں کے پیچھے ہی
کوئی تصویر بن کر مٹ چکی ہوگی
کوئی آیت، کوئی سورت
دُعا بن کر بکھرنے کی صدائیں سُن رہی ہوگی
مگر آنکھیں نہ مانیں گی
یقیں کے مرحلے سے دُور ہوتا
دل نہ مانے گا

مجھے سونے ہی دو
رنگین کڑوی گولیوں کے

خون میں گھلتے ہوئے
ذرّوں میں بہنے دو
زباں پر لڑکھڑاتے اِسم کا جادُو اُترنے دو
میں سونا چاہتی ہوں اب
میں سونا چاہتی ہوں

میں نے اپنے آپ کو دیکھا

میں نے اپنے آپ کو دیکھا
خواب میں دیکھا
میں نے خواب میں دُنیا دیکھی
بہری مورکھ دُنیا کو
چوپال میں بیٹھے
سر جوڑے
منہ موڑے دیکھا
ہاتھوں میں کچھ لفظوں کا سرمایہ دیکھا
تھوڑی دیر کو سایہ دیکھا
ورق اُلٹ کر پڑھنا چاہا تو ہاتھوں پر
بادل جیسی دھند کی گیلی چادر دیکھی

اپنی آنکھوں کو پاتال کے اندر دیکھا
بھید بھری خاموشی دیکھی
اپنے دل میں چُپ کی آگ کو بھرتے دیکھا
دل کو پانی کے چھینٹوں سے ڈرتے دیکھا
سانس اُکھڑتے دیکھی اپنی
اور زبان میں لکنت دیکھی
اپنے جسم کو مرتے دیکھا
دُور کہیں چوپال سے باہر
پچھلی رت کے
بوڑھے پیڑ کا
پتّہ پتّہ جھڑتے دیکھا

تم نے خواب میں کس کو دیکھا؟

گھنے پیپل!

تمہارے سائے میں
جوگی کے بھیگے جسم کی سی باس ہے
پیپل، تمہارے نام میں
کیسے انوکھے سُر لرزتے ہیں
تمہارے نام کے اک حرف میں
اک راگنی کا انگ بستا ہے

وہاں دیکھو
سڑک کے اُس طرف
ساحل پہ
کشتی کے کواڑوں کی دراڑوں میں
تمہاری شاخ پر کھلتا ہوا دل

لہلہاتا ہے

گھنے پیپل!
کوئی آسیب تم میں آبسا ہے
آج اپنے مندروں سے لاتعلق ہو گئے ہو تم
تمہاری گود میں کتنے بسیرے ہیں
جنہیں تم گِن نہیں سکتے

مری آنکھوں میں بھی اک پیڑ ہے
جس میں بسے ننھے پرندے
اپنی اپنی بولیوں کا وِرد کرتے ہیں
مگر اک فرق ہے پیپل،
یہاں کی گردشیں دستور بندی کی نہیں قائل
یہاں پتّے نہیں جھڑتے
تڑخ جاتی ہے مٹی آنکھ کے اندر
مگر اک آنچ ہے
جو پیڑ میں پھیلی رگوں کو سبز رکھتی ہے

تم اپنے سب بسیرے مجھ کو دے ڈالو
گھنے پیپل،
تمہاری چھاؤں میں رستہ بناتی دھوپ بڑھتی جا رہی ہے
اور مجھے بھی دُور جانا ہے
سڑک کے پار دیکھو،
خشک دریا میرا رستہ دیکھتا ہے!

کہیں اک شہر ہے

کہیں اک شہر ہے
جو میری آنکھوں میں سما سکتا نہیں
اُس شہر کی گلیاں
ڈھلکتے آنسوؤں سی
جسم و جاں پر جال پھیلائے ہوئے
جانے کدھر کو جا رہی ہیں
اُس کے گھر آنگن
دریچے، در
مری بینائی پر کب کھل سکے ہیں
اُس کے سبزہ زار
اپنے رنگ کب مجھ کو دکھاتے ہیں

کبھی اس کے خس و خاشاک میں
اُڑتی ہوئی سرگوشیاں
گیلی ہوا میں جذب ہو کر
دُور افتادہ زمینوں پر بسیرا کرنے جاتی ہیں
تو مجھ کو دھیان آتا ہے
کہ میری دسترس میں کچھ نہیں ہے!

یہ دن طویل تھا

یہ دن طویل تھا
کتنا طویل تھا یہ دن

میں اپنا عہد نبھائے بغیر مر نہ سکی
جو زہر میں نے پیا تھا
وہ خام تھا سارا

بہت ہی گرم ہے موسم
مگر مرے دل کے
خنک حصار میں
کوئی بھی بات ایسی نہیں
جو اس تضاد کو مجھ پر بھی آشکار کرے

وہ آگ کا جو سمندر لہو میں بہتا تھا
پگھلتی دھوپ میں بہتی ہوئی جو دُوری ہے
ذرا سی دیر کا دھوکا ہے
اور کچھ بھی نہیں
نہ میں نہ تم نہ کوئی اور
دُور کوئی نہیں ہے
قریب کوئی نہیں
بقا بھی ایک سراب
اور
فنا بھی ایک سراب

یہ دن طویل تھا
کتنا طویل تھا یہ دن

ابھی میں جاگتی ہوں

ابھی میں جاگتی ہوں
اپنی آنکھوں کی طرح
اور بولتی ہوں
اپنی ہی آواز میں
اپنے ہی لہجے میں
ابھی میں ہجر کی تفسیر سے واقف ہوئی ہوں
برف کی دستک کبھی جب رات کی دیوار میں سوراخ کرتی ہے
تو اپنے جسم کو سوراخ میں بھر کر
میں آنے والے دن کا ذکر کرتی ہوں
مرے کمرے میں رکھی ساری چیزیں جاگتی ہیں
اور سب مجھ سے مخاطب ہیں
یہ مجھ سے کہہ رہی ہیں:

موت کا پھولوں سے رشتہ ہے کوئی
گلدان میں رکھے ہوئے پھولوں کی خوشبو
ایک تازہ قبر پر بکھرے ہوئے پھولوں سے ملتی ہے---
زمیں کی گود سے اُگتے
دکانوں پر سجے پھولوں کو کیا معلوم
ان کا موت سے رشتہ ہے کوئی

پھول بھی کافی نہیں ہیں
زندگی یا موت کی خاطر
یہ پورے زخم کو بھرتے نہیں ہیں
اور تھوڑی دیر میں مرجھانے لگتے ہیں
مگر میں جاگتی ہوں
اپنے آنسو کی طرح
اور یاد رکھتی ہوں وہ باتیں
پھول مرجھانے سے پہلے
جو مجھے اچھی لگی تھیں

تمھی ہو

تمھی ہو
مری عمر بھر کا اثاثہ تمھی ہو

مرے ہاتھ میں کوئی ایسا ہنر بھی نہیں ہے
کہ جس سے بہاؤ سمندر کا روکوں
سمندر، جو میں ہوں
سمندر، جو سارا جہاں ہے
سمندر، کہ جس میں زمیں ہے
زمیں سے بڑا آسماں ہے
زمیں، آسماں
بندشوں سے جو آزاد ہیں
اور مقید بھی ہیں

کرب کی منزلوں سے اُدھر، اُس طرف
جانے کیا ڈھونڈتے ہیں
کسے کھوجتے ہیں
یہ کیا چاہتے ہیں---
مری آنکھ میں
کوئی ایسا ستارہ نہیں ہے
جو رستہ دکھائے
مقید زمیں کو
زمیں سے بڑے آسماں کو
جو رستہ دکھائے---
مرے لفظ کی دسترس میں
جو پہلی کہانی تھی
وہ بھی مکمل نہیں ہے
کہ جو کچھ جہاں تھا، وہیں ہے---
تو بس اب تمھی ہو
مری عمر بھر کا اثاثہ تمھی ہو

یہ تازہ نظم میری ہے

یہ میرا اپنا چہرہ ہے
جسے مٹی پہ بنتا اور سنورتا دیکھتی ہوں میں
یہ دونوں ہاتھ میرے ہیں
جو پتھر ڈھو رہے ہیں
رات کے واحد چراغ
اور
لمبے دن کی ناآسودگی کے ساتھ جینے کے لئے
جو دل دھڑکتا ہے وہ میرا ہے
محبت کے فسوں سے سرخ تر یہ خون میرا ہے
نمازِ شکر میں آیات پڑھتے ہونٹ میرے ہیں
یہ تازہ نظم میری ہے
یہ زندہ لفظ میرے ہیں!

پاؤں رکھ زمین پر

پاؤں رکھ زمین پر
دیکھ آسمان کو
دیکھ چاند کی طرف
اس لئے کہ اِس مہیب رات میں
اتنی پُرسکون روشنی اُسی کے پاس ہے

دیکھ اپنے ہاتھ کو
ہاتھ کی زبان پڑھ
ہاتھ ہی میں اوّلین دن کی ایک ایک بات
ہاتھ ہی میں آخری مقام کا نشان ہے

روشنائی اور قلم
دیکھ اِن کے ساتھ ساتھ

لفظ کا عروج ہے
لفظ کا زوال ہے
ذہن میں کوئی خیال ڈھونڈتا ہے راستہ
خلق بھیڑ میں پکارتی ہے
اپنی سمت کھینچتی ہے کیوں
عام راہ سے الگ جو راستہ ہے
اُس طرف بھی دیکھ
اور سوال کر

ہاتھ اور جنبشِ قلم کے ساتھ
اِس مہیب رات میں
وقت سے کلام کر!

سلسلہ در سلسلہ

ادھورے سر پھرے کردار
اپنی داستانوں کے کھلے اوراق پر
بکھرے ہوئے کردار
قندیلیں اٹھائے
نعرہ زن
آتش فشاں سینوں میں پلتے خواب لے کر چل رہے ہیں
اور کہانی ختم ہونے کو نہیں آتی

وہ پہلا لفظ
جو سادہ ورق پر
خون کے بدرنگ قطرے سے
کسی بے کیف لمحے میں

تمہارے اور مرے پُرکھوں نے لکھا تھا
کہانی کے تسلسل سے اُلجھتا ہے

وہی اک لفظ
میرے اور تمہارے درمیاں
پھیلے ہوئے ابہام کی پہلی عبارت ہے
جسے ہم روز و شب تخلیق کرتے ہیں
یہ اُس دُکھ کا صحیفہ ہے
یہ اُس دُکھ کی روایت ہے

وہ پہلا لفظ
جو سادہ ورق پر
خون کے بدرنگ قطرے سے
کسی بے کیف لمحے میں
تمہارے اور مرے پُرکھوں نے لکھا تھا
ذرا سوچو
وہی اک لفظ
میرے اور تمہارے بعد آنے والی نسلوں کی
وراثت ہے!

کتبہ کون لکھے گا

ابھی پہلا ستارہ ڈھونڈتے ہو تم
ابھی تو روشنی آنکھوں تلک پہنچی نہیں ہے
جب شکست وریخت کی منزل سے آگے
سینکڑوں نوری برس تسخیر ہو جائیں گے
تب تم آسماں کی آخری حد پر
زمیں زادوں کی باتیں سُن رہے ہو گے
خلا اندر خلا سیّارہ گاہیں اپنی کم آباد دُنیا کو پکاریں گی
زمیں بھی آشنا دستک پہ چونکے گی
مگر پھر کون بولے گا
گلستاں، رنگ، خوشبو
چہچہاتے پیڑ اور چنگھاڑتے جنگل

اکیلے کیا کریں گے
شہروں شہروں گھومتے دن رات
کس کو تھپکیاں دے کر سلائیں گے، جگائیں گے
کسی ویران قریے میں
الاؤ سینکتے ہاتھوں کی بے مصرف لکیریں
اپنے ہونے کا گلہ کس سے کریں گی
پتھروں کی، برف کی جانب پلٹتی زندگی کو
کون پُرسا دینے آئے گا
خلا اندر خلا گنجان سیّاروں کے سارے خواب
ہجر و وصل کی لذّت کے افسانوں پہ ہنستے خواب
اپنی آخری گردش مکمل کر کے
بے تعبیر رہ جائیں گے تو اِس سانحے پر
کون روئے گا
زمیں زادوں کا کتبہ کون لکھے گا!

آدھے خواب کے بعد

سمندر کو ستارے پی چکے ہوں گے
کناروں سے لپٹتے جنگلوں میں
بھُس بھرے ہاتھی قطاروں میں کھڑے ہوں گے
فنا کی آنکھ میں پھیلے
عجائب گھر کے سناٹے میں
کوئی بھربھری دیوار
ساکت سانس کی بنیاد پر ٹھہری ہوئی ہوگی
زمیں اُکتا چکی ہوگی
ہزاروں گردشوں کے بعد
چہروں کے حنوطی نقش
اپنی ذات کی تصدیق چاہیں گے

تو نیلے آسمانوں پر بھٹکتی انگلیاں
وہ نظم لکھیں گی
جو آدھے خواب کی منزل میں
ہم سے نامکمل رہ گئی تھی!

آخری معجزہ

بہت بھیگے ہوئے دیوار و در ہیں
اور آنسو تھم گئے ہیں
بے حس و حرکت کوئی تصویر
میرے سامنے
اک چوکھٹے میں دم بخود
مجھ کو بلکتا دیکھنے کے بعد جیسے جاگ اُٹھی ہے
ہوس کا رقص کرتا
ایک بد ہیئت پجاری
دیو قامت آئینے کی قید سے باہر نکلنا چاہتا ہے
چوکھٹے میں جاگتی تصویر کا اک ہاتھ
میرے سر پہ ہے
مریمؑ کا بیٹا

معجزہ دکھلا رہا ہے---

خواب میں سہمی ہوئی
مٹی کی مورت
خواب کی تعبیر لکھنا چاہتی ہے!

عجب اُلجھن ہے

عجب اُلجھن ہے
جس کی تہہ میں
کوئی دُکھ نہیں ہے
سُکھ نہیں ہے
رات
جس کی کوکھ میں تارے نہیں ہیں
اور اندھیرا بھی نہیں ہے
آنکھ
جو بے در نہیں ہے
اور کھُلتی بھی نہیں ہے
کیا عجب یہ لوگ ہیں
جو فیصلوں کے زخم سہتے ہیں

مداوا کچھ نہیں کرتے
نہ کوئی بات کرتے ہیں
نہ لب سیتے ہیں
کوئی بات سنتے ہیں
نہ رد کرتے ہیں
رستے میں چراغ اتنے جلاتے ہیں
کہ رہ گیروں کو گہری رات میں سائے کا چہرہ تک نظر آئے
مگر گھر بند رکھتے ہیں
درو دیوار کی درزوں کو بھرتے ہیں اندھیروں سے
پھر اس کے بعد بیٹھے سوچتے ہیں
روشنی کیوں ان درو دیوار پر
دستک نہیں دیتی

ہوا کی لوح پر

ہوا کی لوح پر لکھے ہوئے پَل میں
تمہیں جس آنکھ نے دیکھا
تمہیں معلوم ہے
اس آنکھ میں اک راستہ ہے
اور اک اندھا مسافر
اس پہ صدیاں طے کرے گا
جاگتی اور بولتی صدیاں
لہو کی وحشتوں میں بھاگتی صدیاں
پرانی ہڈّیوں میں رینگتی صدیاں
تمہیں معلوم ہے
اس آنکھ میں جو راستہ ہے
وہ جہاں پر ختم ہوتا ہے

وہاں چہرے بھی پہچانے نہیں جاتے
زمانوں سے زمانوں تک
وہاں سب نام
جس کے نام میں تحلیل ہوتے ہیں
اُسی کے اِذن سے میں ہوں
اُسی کے اِذن سے تم ہو
اُسی کے اِذن سے صدیاں مسافت طے کریں گی!

Mosaic

ایک سمندر جس کے ساحل ریگستانی
ایک سمندر جس کا انت ہے کالا جنگل
ایک سمندر جس کے سارے سبز کنارے
ایک سمندر جس کی حد پر نیلا پربت
ایک سمندر جس کے پار اُفق کی لالی
ایک سمندر جس کی ہر اک سمت سوالی
ایک سمندر جس کے چاروں اُور سمندر
ایک سمندر جس میں ایک سمندر گم ہے
ایک سمندر جس کی تہہ کے اندر تم ہو
ایک سمندر جس کی موج پہ میرا گھر ہے

دو آوازیں

دو آوازیں
دونوں جھوٹی
دو چہرے
دونوں ہی مسخ
دو راتیں
دونوں ہی کالی
دو لمحے
دونوں بے جان
دو اندھی
اور
دو پہچان سے عاری آنکھیں
دو سائے

دونوں انجان
دو دیواریں
دونوں اونچی
دونوں پر اک لفظ
لفظ مرے ہاتھوں کا لکھّا
مجھ سے مٹ نہیں پائے
سر پٹخوں تو
خون کا دھبّہ
لفظ پہ بنتا جائے!

میں شاعر ہوں

میں شاعر ہوں
مری تہذیب میں ڈھلتے لہو کی تیز سرخی سے
تمہارے نقش تیکھے ہو گئے ہیں
تم مری ساری ریاضت چھین لیتے ہو
جو دُکھ پل کر جواں ہوتا ہے
اس کو تم سے نسبت ہے
جسے میں خود بھلا دیتی ہوں
وہ دُکھ دُوسرا ہے
وہ مری اپنی کہانی ہے
مرے ہونے نہ ہونے کا تو قصہ
تم سے ملتا ہے
تمہارے دل سے ملتا ہے

میں شاعر ہوں
مری تہذیب میں بھیگے ہوئے موسم کی نرمی ہے
میں جب پتھر کو چھوتی ہوں
وہ بارش میں بدل جاتا ہے
تم پتھر نہیں ہو
اور تمہیں بارش سے بھی رغبت نہیں ہے
تم مسافر ہو
تُمہارے رات اور دن میری آنکھوں سے اُلجھتے ہیں
تعاقب کے پرانے کھیل میں
لفظوں کی گنجائش نہیں ہے
اور میں شاعر ہوں
مرے ہونے نہ ہونے کا بھی قصہ
تم سے ملتا ہے
تمہارے دل سے ملتا ہے

ایہہ گل الف سجھائی

سمندر کی معلوم حد سے
کسی اور حد تک
سفر ہی سفر تھا
مرا تو سمندر میں گھر تھا
میں دشت و بیاباں سے دُور
اپنی گہرائیوں میں مگن تھی
روانی میں رستہ بناتے ہوئے
ڈوبتے چڑھتے سورج کے
کرنوں بھرے تھال کو
میں نے ہاتھوں میں لے کر اُچھالا
تو میرا خُدا مسکرایا
اُتر کر زمیں پر وہ آیا

محبت سے کہنے لگا
میں نے دشت و بیاباں تمہارے لئے ہی بنائے ہیں
تم ان میں گھومو پھرو---
میں نے دشت و بیاباں میں چلتے ہوئے
ریت پر پاؤں رکھتے ہوئے
ریت سے مٹھّیاں اپنی بھرتے ہوئے
رقص کرتے ہوئے
ڈوبتے چڑھتے سورج کو اپنا کھلونا بنایا
تو میرا خُدا مجھ سے کہنے لگا
میں نے چاند اور ستارے
ستاروں پہ پھیلے ہوئے آسماں
سب تمہارے لئے ہی بنائے ہیں
ان کو بھی دیکھو---
میں تاروں پہ چلنے لگی
اپنا رستہ بدلنے لگی
روشنی اپنے چہرے پہ مَلنے لگی
سخت جاں تھی پگھلنے لگی

تو خُدا میرے ہونے کے
تصدیق نامے پہ
مُہرِ شہادت لگا کر
بہت راز داری سے کہنے لگا
جاؤ اب اپنے خوابوں سے کھیلو
مگر دھیان رکھنا
جو مٹی تمہارے رَگ و پے میں بہتی ہے
وہ مجھ کو محبوب ہے!

ستارے

ستارے میرے کمرے میں نہیں ہیں
آسماں پر ہیں
اگر یہ پاس بھی ہوتے تو کیا ہوتا
مری دُنیا میں شاید تھوڑی روشنی ہوتی
اگر یہ ٹوٹ کر گرتے تو کیا ہوتا
مگر یہ ٹوٹ کر اب بھی تو گرتے ہیں
مرے کمرے کے اندر گھپ اندھیرا ہے

ستارے میرے دل میں ہیں
فنا ہوتے ستاروں سے برستے سنگ ریزے
ننھے ننھے سنگ ریزے
آسماں کی وسعتوں میں
کیسے کھو جاتے ہیں
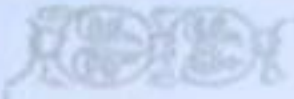
اور اب دل میں اُڑتے ہیں
تو رنگت خون کی خاکستری ہے
آگ کی لپٹوں سے اُٹھتی روشنی
پیغمبروں کے خون میں بہتی ہے
جامد، خودنگر، خودسوختہ، زرّیں ستارے
ان کا حصہ ہیں

یہ پتھریلے ستارے بھی ستارے ہیں
بدن کی خاک میں اُڑتے
ازل سے روشنی کا وِرد کرتے
گردشوں میں گم،
ستارے میرے ماتھے پر
ستارے میری مٹھی میں
بدن کی دھوپ میں
گھرے اندھیرے میں
دہکتی خاک سے لپٹے اندھیرے میں!

جن چھوٹی چھوٹی باتوں سے.....

چاند کے پتھریلے چہرے پر
سیاروں کے دامن پر
دل میں پھیلی آسمان کی نیلاہٹ پر
چل کر دیکھو
چل سکتے ہو؟
تارے ہاتھ میں آتے ہیں
یا ہاتھوں سے گر جاتے ہیں
کون یہاں کی پہنائی میں رہ سکتا ہے؟
آدھے جسم کا نوحہ لکھو
جو دلدل کے اندر ہے
باقی آدھے جسم کے اندر
اپنے پورے خواب کو دیکھو

جس میں پوری کائنات کی وسعت ہے
اس کی حد کو چُھو کر دیکھو
چُھو سکتے ہو؟
دل کو خواب سے بھر کر دیکھو
بھر سکتے ہو؟
دل، جس میں اک بانس کا جنگل
اس جنگل کے بیچ میں دریا
اور دریا کے بعد سمندر
اس سے لَوٹ کے آ سکتے ہو؟
دل، جس میں صحرا ہی صحرا
اور صحرا کے بعد بھی دُوری
کیا اتنی دُوری کی تہہ سے
ذرّے گن کر لا سکتے ہو؟
جن چھوٹی چھوٹی باتوں سے
یہ دل بوجھل ہو جاتا ہے
ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو
اس وسعت میں چھپا سکتے ہو؟

کبھی اُس شہر سے ملنے نہیں آتا کوئی

کبھی اُس شہر سے ملنے نہیں آتا کوئی
بیچ میں رات سمندر کی طرح گہری ہے
دن کسی اور طرف جاتا ہوا رستہ ہے
اور رستے پہ وہ آنکھیں ہیں
جو مانوس نہیں نیند سے، بیداری سے
وقت کو نیند نہ بیداری کی سرحد معلوم---
ہجر یا وصل کی یہ بات نہیں
بات ہے کچھ اور
جسے کہنے سمجھنے کی ضرورت بھی نہیں
جیت جاتی ہے جہاں موت
وہاں پر
کوئی رشتہ، کوئی پیوند، کوئی خواب پنپتا ہی نہیں---

دھند کا اوڑھے لبادہ جیسے یگ بیت گئے ہیں
اسے معلوم بھی ہے
بچّیاں بیٹھی ہیں ہاتھوں میں لئے دَف
کہ بشارت ہو تو گائیں کوئی گیت
راہ کے دونوں طرف سوئے ہوئے
پیڑوں پہ پتّے جاگیں
اور دریاؤں میں پانی بھر جائے---

زندگی جسم نہیں
جسم سے برتر ہے
کسی کو یہ پتہ بھی تو نہیں
ماسوا اس کے جو کہتا نہیں کچھ
اور ہر اک جھوٹ کو سچ مانتا ہے
اور سچ کیا ہے
بہت اچھی طرح جانتا ہے!

کتاب

کتابوں میں بہت سے راستے ہوتے ہیں
گلیاں، شاہراہیں
شہر
اک دُنیا
تمہارے اور میرے دل کی صورت
زندگی کی دھجیوں کو جوڑ کر بنتی ہیں
کچی اور سچی داستانیں
بے بضاعت خواب اور ان کا لہو
آزُردگی کا بوجھ ڈھوتے جسم کی بو
میلے برتن بھوک اور آوارگی
ذہنِ انسانی میں پلتا جرم اور اس کی سزا
آسودگی کا مخملیں ملبوس

نفرت

انقلابی دائرہ
انسان کی جانب پلٹتی زندگی کی ہاؤ ہو
جال میں لپٹا تعلق
اور اس کا تار و پود
سوچ کے مضبوط دھاگے سے بندھا ہنگامِ غم
خواب کے باریک پُل پر کھو کھلی خالی ہنسی
وقت کے خانوں میں چہروں کا ہجوم
اپنے دل کی خانقاہوں کی طرف جاتا ہوا
ایک اک چہرے کے اندر اک کتاب
ایک اک چہرے کے پیچھے
کتنے سائے بے نقاب
ایک اک سایہ کتاب
اور ہر سائے کے اندر دُکھ کئی
دُکھ کی ہر تفصیل کے اندر کتاب
زندگی کا اوّلیں مذہب کتاب
آخری خواہش کتاب---

آج میں پڑھتی رہی ہوں
اک کتاب اپنے تحفظ کے لئے
اور ایک
باقی سب کتابوں کو بھلانے کے لئے

نیا دن

واژگوں رات ہے
اور اندھیرا
نئے دن کی منزل میں بہنے لگا ہے
نیا دن
سوالی نگاہوں سے
گہرے خلا میں
بدلتی ہوئی وسعتوں کی طرف دیکھتا ہے
سوالی نگاہوں میں
بہتی نمی
اشک بن کے ڈھلکتی نہیں
دن کا بیدار دل
نیند کے بند خیمے کے باہر کھڑا

دھڑکنوں کی صدا سُن رہا ہے
انہیں گن رہا ہے
نیا دن
اُجالے کی اکھڑی ہوئی سانس پر
عہد نامے کے لفظوں سے بہتی ہوئی روشنائی میں
گم ہو گیا ہے
نیا دن
لڑھک کر
اندھیرے کی اندھی چٹانوں میں
زخمی پڑا ہے
نیا دن
اُجڑنے لگا ہے

سفر آغاز کرنا تھا

مجھے ترتیب دینا تھا
گزرتے وقت کو
لمحوں کی بندش سے کہیں آزاد ہونا تھا
کہیں زنجیر ہونا تھا مجھے ان میں
کہیں دن رات کے بہتے سمندر پر مجھے
تخلیق کرنے تھے سفینے
اور سفینوں کے لئے ساحل
بنانی تھی مجھے تصویر ماہ و سال کی
اور پھر
سمٹنا تھا مجھے تصویر کے رنگوں میں
خاکے کی لکیروں میں

مجھے ترتیب دینا تھا
دلِ بے سمت کی بے انت بے چینی کو
مجھ کو جمع کرنے تھے وہ اعضا
جن میں رُوحیں قید ہوتی ہیں
مجھے سینے میں گڑتی سانس کو ہموار کرنا تھا
مجھے اُس جھوٹ کا چہرہ بنانا تھا
جو میرے سچ کی پاکیزہ حدوں میں
درد کی فصلیں اُگاتا تھا

مجھے ترتیب دینا تھا
سرابی وسعتوں کو
راستے تجویز کرنے تھے
مجھے قدموں کو اک لمبی مسافت کا یقیں دینا تھا
پیروں میں بگولے اور ہاتھوں پر ستارے باندھنے تھے
ساتھ لینا تھا مجھے اُس روشنی کو
جو عذاب و خواب کے ٹکراؤ سے پھوٹی تھی
اپنے آپ سے اک عہد کرنا تھا
سفر آغاز کرنا تھا

سمجھتا تھا
عقب میں ایک بستی جل رہی ہے
اور میری پشت پر آنکھیں نہیں ہیں!

آزاد کردو سب پرندے

چھوڑ دو
در کھول دو
آزاد کردو سب پرندے
ان پرندوں میں تمہارا جسم ہے
ان میں تمہارا دل دھڑکتا ہے
تمہاری رُوح بے کل ہے کہیں ان میں
انہیں آزاد کردو

رات ہوتے ہی
پروں کی پھڑ پھڑاہٹ میں
وہ ساری داستانیں جاگ اُٹھتی ہیں
جنہیں تم نے کبھی سوچا ہے
جنہیں تم نے سُنا ہے

تم نے لکھا ہے
انہیں آزاد کردو

گھپ اندھیرے سے نمی رِسنے لگی ہے
قیدیوں کی بند آنکھیں
نیند میں بھی جاگتی ہیں
کس قدر کہرام ہے ان میں
اب ان کے زرد چہروں میں سنہرا رنگ بھر دو
سرد جسموں کو نیا ملبوس پہنا دو
انہیں آزاد کردو
خون کی یہ آخری گردش ہے
اس کے بعد دہشت کا سفر ہوگا
کہ برفیلی ہوائیں زندگی کے روزنوں کو بند کردیں گی
انہیں آزاد کردو

دائرہ

ڈُور کی بات
تازہ خبر کی طرح
اک کہانی
کتابوں کے اوراق پر
فلم کی رِیل پر
خون
بارُود
زخموں کی سیلن
دھواں
وردیاں
فتح کی سنسنی
فتح کی نغمگی

نعرہ زن بستیاں
فتح خود رقص گر
چشم ولب
منتظر
بام پر
مسخ چہروں پہ لکھے صحیفے
کسی نے پڑھے
پڑھ کے ان کو بُھلا بھی دیا
کتنی رُوحوں کی اک مضطرب قبر پر
ایک نوحہ سُنا
اور دل سے اُتر بھی گیا
موت کی شاخ پر
زندگی
سبز پتّے لئے چھا گئی
پھر کہیں طبل بجنے لگے
جسم جلنے لگے

میں منزل ہوں

میں زندہ رہنے کی خواہش میں زندہ ہوں
ساحل پر چُپ چاپ کھڑی ہوں
سوچ رہی ہوں
اتنے بڑے سمندر پر
میری بینائی حاوی ہے
میری آنکھوں کی سرحد میں
سُورج ڈُوبا اور پھر اُبھرا
میری سوچ کے تہہ خانے میں
سات سمندر
سات زمانے
سات افلاک
میری خواہش سب اندیشوں سے برتر ہے

میرے اندر موت کی ضد ہے
میرے اندر موت کا گھر ہے
میں منزل ہوں
باقی ہر تخلیق سفر ہے

جھوٹ سچ کے سنگم پر

جھوٹ سچ کے سنگم پر
آبشار گرتا ہے
آبشار کے اندر
دو چراغ بہتے ہیں
صد ہزار قطروں میں
ایک شکل بنتی ہے
آب و خواب جلتے ہیں

جھوٹ سچ کے سنگم پر
سوچتا ہوا سایہ
اک سوال کرتا ہے
دھند میں بچھے رستے
سب کے سب ادھورے ہیں

سب جواب پورے ہیں

جھوٹ سچ کے سنگم پر
تہہ بہ تہہ زمانوں میں
سات آسمانوں میں
ایک رُوح پھرتی ہے
فاصلے پہ رہتی ہے
فاصلے سے ڈرتی ہے

جھوٹ سچ کے سنگم پر
شام کی لکیروں میں
اک لکیر کے اُوپر
ایک سُر لرزتا ہے
ایک نظم کا ٹکڑا
سانس میں بھٹکتا ہے

جھوٹ سچ کے سنگم پر
آج کی کہانی کا
اختتام جو بھی ہو

شہر کے دریچوں میں
رات ہونے والی ہے
صبح کو ستاروں سے
مات ہونے والی ہے

کہو کس شہر میں ہو تم

کہو کس شہر میں ہو تم
تو کیا اُس شہر میں بھی تیز بارش ہے؟
کہو کس کی نظر میں ہو
تو کیا اُس آنکھ میں
انہونے رستوں کی کہانی ہے
کہو کس راستے پر ہو
ابھی،
اس وقت،
کس مشکل میں ہو
بولو
تمہارے سائے کے اندر جو سایہ ہے
وہ کیسی رُوح

کیسے جسم کا ہے

بجھتے رنگوں میں
پرانی زرد تصویروں میں
آنے والے وقتوں میں
مجھے تم دیکھنا
اور سوچنا
یہ کون ہے
پھر پوچھنا
کس شہر میں ہے یہ
تو کیا اُس شہر میں بارش تھمی ہے؟

کبھی جب.....

کبھی جب دل کی حد میں دو مخالف راستوں کا میل ہو جائے
تو کوسوں دُور کا منظر بھی آنکھیں دیکھ سکتی ہیں
دھند لکے کا طلسمی راستہ
اسرار کی زد سے نکل جائے
تو ہر شے خواب سی، جاگی ہوئی معلوم ہوتی ہے
اچانک دن نکلتا ہے
اچانک رات ہوتی ہے

ہمیں سچ بولنا ہے

ہمیں سچ بولنا ہے
اپنی خاطر
اور پھر سچائی کی تنسیخ کرنی ہے
سنبھلنے کے لئے
پتھر سے بھاری سچ کو
اپنے سرد ہاتھوں میں جلا کر موم کرنا ہے
پگھلتے موم کو آسودگی کا نام دینا ہے
اسی آسودگی پر ایک زندہ شہر کی بُنیاد رکھنی ہے
اور آنکھیں بند کر کے شہر کو تعمیر کرنا ہے!

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ بچپن سے جُدا ہونے میں مدت بیت جاتی ہے
فصیلوں کے اُدھر
سب رنگ
آنکھوں سے
بہت ہی دیر تک
اوجھل بھی رہتے ہیں
سمندر ساحلوں پر جب
کسی طوفان کے آغاز کا اعلان کرتے ہیں
تو آنکھیں ریت میں چُھپ کر نظارہ دیکھتی ہیں
غم، خوشی
جذبوں کی ویرانی کے

گمنامی کے موسم

دیر تک جامد دلوں میں ٹھہر جاتے ہیں
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

سمندر کے اُدھر کوئی کنارہ منتظر رہتا ہے
چڑھتے ڈُوبتے سُورج کی کرنیں
ریزہ ریزہ وقت کو پگھلا کے
عمروں کی نفی کرتی ہیں
رستہ دیکھتی آنکھیں
نئے ملبوس سے
زردی کی رنگت جذب کرتی ہیں

پھر اک دن دُور سے
شاید بہت ہی پاس سے
سچائی کا اک لمحہ کوئی اسم پڑھتا ہے
وہیں لب بستگی آواز بنتی ہے
اور آنکھیں
جسم کی گٹھڑی اُٹھائے

خوف کو تسخیر کرتے
گہرے پانی میں اُترتی ہیں
کہیں دو ایک لمحوں کو پلٹ کر دیکھتی ہیں
اور پھر گہرائیوں میں ڈُوب جاتی ہیں
کنارہ بین کرتا ہے نہ روتا ہے
کبھی ایسا بھی ہوتا ہے

تمہارے بیٹے سے میں کہوں گی

تمہارے بیٹے سے میں کہوں گی
کہ بند کمرے میں چڑھتے سورج کی روشنی ختم ہو گئی ہے
کہیں ستاروں کے اور زمینوں کے رابطے میں خلل ہے کوئی
کہیں کوئی درمیاں کھڑا ہے
زمین سورج کی تیز دستک سے ڈر گئی ہے

وہ لمحہ جس نے بہار دیکھی نہ اُس کی آمد کا خواب دیکھا
وہ اپنا موسم گزار کر دُور جا چکا ہے
وہ آنکھ جس نے نہ صبح دیکھی نہ صبح کی آب و تاب دیکھی
وہ دن کے باقی تمام حصوں کو
اپنی پتلی میں جذب کر کے
انہی سے منسوب ہو چکی ہے

وہ جسم جس نے نہ ہجر مانگا
نہ زندگی سے وصال مانگا
وہ اپنے حصے کی آگ میں جل کے سو گیا ہے
وہ ذہن جس نے حدوں کو تسخیر کر لیا تھا
وہ ذہن جس نے
سیاہ رستوں پہ قصۂ مہر و ماہ لکھا
وہ ذہن نا مطمئن رہا ہے

میں اُس سے پوچھوں گی
وہ بتائے
جو سب کتابوں میں
سب صحیفوں میں منتخب تھا
وہ نام کیا تھا
سمندروں سے نہ ندّیوں سے نہ بادلوں سے
نہ آنسوؤں سے جو دُھل سکا تھا
وہ خواب کیا تھا
جو اپنے ماضی سے
اپنے فردا سے

اپنے مذہب سے بھی بڑا تھا
وہ عہد کیا تھا
میں اُس سے پوچھوں گی
اور اُس کے جواب کی منتظر رہوں گی

تمہارے بیٹے سے میں کہوں گی

کیسی کیسی لکیریں ہیں.....

کیسی کیسی لکیریں ہیں مٹی کی دیوار پر
جیسے باتیں مفصّل ہوں
اور وقت ہو مختصر
جیسے لفظوں کے انبار
تخلیق کی آنچ سے بے خبر
جیسے قامت کو چُھونے کی خواہش میں
جلتے ہوئے بال و پر
جس طرح ہنستا بستا ہوا
پھر بھی خالی بہت کوئی گھر
جیسے معصوم بچے کے چہرے پہ
محرومیت کا اثر
ایک تازہ کلی

جیسے سُوکھی لرزتی ہوئی شاخ پر
موت کی منتظر آنکھ میں
جیسے جینے کا ڈر
سرد پانی کے تھوڑے سے چھینٹے
اُداسی کے جنگل میں بڑھتی ہوئی آگ پر

اپنے چہرے پہ آنکھیں بناؤ مرے نقش گر!

اب مجھے بھول رہا ہے

اب مجھے بھُول رہا ہے کہ وہ گھر کونسا تھا
جس کے لئے میں نے ستاروں پہ کمندیں ڈالیں
ابرپاروں کے اُترنے کو بنائے زینے---
اب مجھے بھُول رہا ہے کہ وہ غم کونسا تھا
جس نے ستاروں سے بھرے باغ کو بے نُور کیا
ابرپاروں سے اُڑا لیں بوندیں---
اب مجھے بھُول رہا ہے کہ وہ شے کونسی تھی
جس کے لئے بھاگ رہی تھی میں ہوا کے پیچھے
ایسے رستے پہ جہاں وقت بھی موجود نہ تھا---
اب مجھے بھُول رہا ہے کہ وہ لمحہ کیا تھا
سالہا سال جسے میں نے قفس میں رکھا
جس کی چیخیں مجھے دہلاتی رہیں

اور چادر میں چھپائے منہ کو
نیند کو میں نے بہانہ رکھا---
اب مجھے بھول رہا ہے کہ وہ دل کونسا تھا
جس کے لئے میں نے بڑا ظلم کیا
خود پہ کہ اوروں پہ
یہ ظاہر نہیں ہوتا مجھ پر
ظلم سا ظلم
کہ جس کی کوئی حد ہے نہ شروعات کہیں---
اب مجھے بھول رہا ہے کہ وہ دن کونسا تھا
جب مجھے معلوم ہوا تھا
کہ کسی سچ میں کوئی وزن نہیں
عدل کے بھی کئی مفہوم ہیں اور
ظلم کی طرح سزا کی کوئی میعاد نہیں

طلسمِ غم نہیں ٹوٹا

طلسمِ غم نہیں ٹوٹا
میں کب سے ہاتھ میں
کاغذ قلم تھامے
قطار اندر قطار
اُڑتے ہوئے لفظوں کو
موسم کے بدلنے کا یقیں دلوا رہی ہوں
اور اپنی بات کی کم مائیگی پر ہنس رہی ہوں
زخم سے رِستا لہو
پیڑوں پہ گرتی برف کی رنگت سے شرمایا ہوا
آہستہ آہستہ
چمکتے فرش پر جمنے لگا ہے
آسماں خالی ہے

پتھریلے ستارے

کاغذوں پر جا بجا بکھرے پڑے ہیں
اور سُورج اس کے ماتھے پر چمکتا ہے
جو میری رات کا حصہ بھی مجھ کو دے نہیں سکتا

مرے غم!
تجھ کو زندہ رکھنے والی ساعتیں
کیسی بُلندی پر بنی تھیں

میرے غم!
تو جسم و جاں کی قید سے باہر نکل
اس ہاتھ کو جا چُوم لے
جس ہاتھ نے جبریلؑ کے اُجلے پروں پر
میری بے مایہ دُعاؤں کے اثر کا باب لکھا تھا،
تجھے شاداب لکھا تھا

مرے غم!
تو مکمل ہے
تری تخلیق میرا معجزہ ہے!

میں تمہارے رستے میں

میں تمہارے رستے میں
بیچ پھینک آئی تھی
سایہ دار پیڑوں کے
رنگ رنگ پھولوں کے
تم نے ان کو دیکھا بھی؟
میرے آسماں پر تو
رات چھا گئی گہری
صبح تک سفر میرا
بے یقین لمحوں سے
روشنی کے لمحے تک
ختم ہی نہیں ہوتا

رات کی اُداسی کے
اُس طرف جو دُنیا ہے
اُس میں کتنے سُورج ہیں
اُس میں کتنے چہرے ہیں
اور ایک چہرہ تو
اِس مہیب شب کے پار
میں بھی دیکھ سکتی ہوں

اِس طرف کی دُنیا سے
اُس طرف کی دُنیا کا
کوئی رابطہ بھی ہے؟
اُس طرف سے کیا کوئی
مجھ کو دیکھ سکتا ہے؟
رنگ رنگ پھُولوں کے
سایہ دار پیڑوں کے
بیج پھینک سکتا ہے؟

لفظ بھربھرے کیوں ہیں

لفظ بھربھرے کیوں ہیں
سانس کی روانی میں
ریت بھر گئی ہے کیوں
کتنی خشک مٹی ہے
کتنا سرد پتھر ہے
پھول کتنے تازہ ہیں
کیا عجیب منظر ہے

خود سے جُھوٹ کہتی ہوں
سچ بھی بولتی ہوں میں
پھر بھی کچھ نہیں ہوتا
دل پہ سُرخ پھُولوں کا
بوجھ اس قدر کیوں ہے

دل بھی قبر ہے کوئی؟
اس میں کون زندہ ہے؟

موت زندگی کے ساتھ
بے ارادہ چلتی ہے
جب دیا جلاتی ہوں
ہاتھ میرا جلتا ہے
زخم کے دریچے سے
خون بہہ نکلتا ہے
وقت ہاتھ ملتا ہے

راستہ بدلنے سے
تیز تیز چلنے سے
پاؤں تھکنے لگتے ہیں
اک طویل موسم کی
بے حساب بارش میں
کچھ بھی نم نہیں ہوتا
سانس کی روانی میں
ریت بھرتی جاتی ہے
بوجھ کم نہیں ہوتا

مارچ

ہُو کے عالم میں
خموشی اپنی جانب کھینچتی ہے
دُور تک پھیلا یہ منظر
کتنا خالی ہے،
بہت خالی
کہیں یادوں کے تہہ خانے میں
آسُودہ، پرانی قبر کی صورت
جہاں خواب و خلش باقی نہیں ہیں

نوحہ گر کوئی اِدھر آتا ہے
تازہ غم لئے
تو اپنے حصے کے گلابوں سے

کبھی دو چار کلیاں
اجنبی قبروں کی خاطر چھوڑ جاتا ہے

جو سُن سکتے ہیں
وہ تو جانتے ہوں گے
کہ تنہائی کی بھی آواز ہوتی ہے
اور اس آواز کے عادی
کبھی نوحہ نہیں کرتے، نہ سنتے ہیں
نہ کلیوں کے لئے بے چین ہوتے ہیں

مجھے کچھ یاد پڑتا ہے
میں جس بستی میں رہتی تھی
وہاں پر اِس مہینے میں
بہت ہی پھول کھلتے تھے
وہاں سے لوگ اب کی بار بھی ملنے کو آئیں گے
بہت سے پھُول لائیں گے

ایک دو تین چار

ایک دو تین چار
ساتھ جا رہے ہیں ہم
بیچ ایک ناؤ کے
جھیل اک کتاب ہے
جس کا ایک اک ورق
میرے سامنے کھُلا
اور بند ہو گیا
جھیل اِک سراب ہے

ریگ زار ریگ زار
دیکھ دُور تک کہیں
پیڑ ہیں نہ پھُول ہیں
اور اُفق کے اُس طرف

ایک شہر منتظر

شہر بھی عجیب سا

خوف سے تنا ہوا

وہم سا کہ خواب سا

راستہ بندھا ہوا

پاؤں میں رُکا ہوا

شاہراہ کی طرف

کوئی دیکھتا نہیں

کوئی جانتا نہیں

کون سمت ہے قریب

کون ساعتیں ہیں راس

یہ لپیٹ چراغ کی

آگ ہے کہ نُور رہے

کوئی سوچتا نہیں

سوچ اک عذاب ہے

زندگی اے زندگی

تیرے میرے درمیاں

کوئی بھول اب نہیں
کوئی جال اب نہیں
موت میں نے دیکھ لی
زندگی اے زندگی
موت سے بڑا نصاب
تیرے ہاتھ میں نہیں
میری بات کا جواب
تیری بات میں نہیں

تمھیں یاد ہے؟

وہی اصل ہے
جو قریب ہے
جو نظر کی حد میں ہے
لمس کے رگ وپے میں جس کی نمود ہے
وہی اصل ہے
وہی رات ہے
وہی دن ہے
اور وہی شام کے
کسی نرم لمحے کا عکس ہے
وہی چشم ہے
وہی لب ہے
اور وہی لفظ ہے

وہی گفتگو کی مسافتوں کا رفیق ہے
وہی سائباں
وہی آب و خاک کے راستے میں
سفر کی جائے اماں بھی ہے
وہی تم ہو
اور وہی میں بھی ہوں

تمہیں یاد ہے
کبھی تم نے مجھ سے کہا تھا
بس تمہیں چاہیے
کوئی شخص جو
تمہیں یاد رکھے
ہزار قرن کے فاصلے پہ بھی ہو مگر
تمہیں سوچتا ہو
تمہارے دھیان میں جاگتا ہو
یہی کہا تھا
یہی تو بس مجھے یاد ہے
تمہیں یاد ہے؟

جیسے کچھ ٹوٹ گیا

جیسے کچھ ٹوٹ گیا
یونہی اچانک
کسی آدرش کی جاگی ہوئی مورت
کوئی دل

منظرِ صبح میں جس کے لئے ہنگام تھا
وہ رنگ کوئی رنگ نہ تھا
شام کے خوف میں جھلکی ہوئی اُمید
ستارہ بھی نہ تھی
موج در موج سمندر جسے سمجھا
وہ سمندر ہی نہ تھا
ایک آوازِ دلآویز

وہ آواز نہ تھی
جس کے لئے لفظ تراشے جاتے
جس سے مانوس ہوئی میری بصارت
وہ نظر
میری طرفدار نہ تھی

وہ مری اپنی کمی تھی کوئی
جس نے منظر کئی تخلیق کیے اپنے لئے
یہ مری اپنی کمی ہے کوئی
جو معمے کو کبھی حل نہیں ہونے دیتی
ایک مشکل سے کسی دوسری مشکل کا پتہ لیتی ہے
کبھی سچائی کو منزل نہیں ہونے دیتی
سحر جو ٹوٹ گیا اس کے مقابل نہیں ہونے دیتی

چڑیا کی بیاض سے

چُوں چُوں چُوں چُوں چڑیا بولی
جنگل کی ٹولی نے مل کر شور مچایا
کُتے بھاگے
کوّے جاگے
بھوں بھوں بھوں بھوں
کائیں کائیں
دُور نہ جائیں

گھر چوبارا
ہٹی کھوکھا
مسجد منبر
گلیاں سڑکیں
کھیت کھنڈر جل
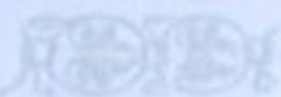
میلے ٹھیلے
شور شغل میں
کتنی دُنیا
چہرے مُہرے
نئے نویلے
سبھی اکیلے
بھوں بھوں بھوں بھوں
کائیں کائیں

کان میں بالی
لونگ سجیلا
چھن چھن چُوڑی
نقش کٹیلا
اُجلے کپڑے
چندن جسم اور وقت نشیلا
بھوں بھوں بھوں بھوں
کائیں کائیں

سوکھے پورے سات سمندر
ناؤ کے اندر
رزق نہ روزی
دھان نہ دانہ
بھوں بھوں بھوں بھوں
کائیں کائیں

خون کی ہولی
دل کا سجدہ
آنکھ مچولی
حرف کہانی
پاک کتابیں
ساری تھوڑی دیر کی باتیں
ناری تُو کیا سوچ رہی ہے
کیوں بالوں کو نوچ رہی ہے
دیکھ ہوا کتنی تیکھی ہے
کس کا رستہ دیکھ رہی ہے
اب تُو پت جھڑ کی ڈالی ہے

گئے سمے کی ہریالی ہے
دل کی میلی اور کالی ہے
بھوں بھوں بھوں بھوں
کائیں کائیں

دل کا پکّا سب سے سچّا
جنگل بستی گھوم رہا ہے
چپّہ چپّہ سُونگھ رہا ہے
بھوں بھوں بھوں بھوں
کائیں کائیں

رستہ لمبا دن ہیں چھوٹے
چڑیا چُوں چُوں کیسے بولے
کُتے اونگھے
کوّے سوئے
اب جنگل کی باری آئی
جنگل سے آواز ملائیں
جنگل بولا سائیں سائیں

چراغ آفریدم

یہ آخر
کتنا دُکھ بانٹے گی
کتنا ساتھ دے گی
بُجھتی آنکھوں کا
کتابوں میں محبت کے فسانوں سے
تعلق جوڑتی معذور آنکھوں کا
یہ سچ ہے
شام ہوتے ہی
جو پہلی روشنی جلتی ہے
اب وہ جلتی رہتی ہے
مری آنکھوں کی صورت
نصف شب کے دائرے میں

نیند سے بوجھل نہیں ہوتی
یہ اب محکوم ہے میری
مرا خالق مگر ہنستا ہے
جب میں رات بھر
آنکھوں میں گھلتی نیند سے لڑتی ہوں
اپنی روشنی کو خود بجھاتی ہوں

ایک بستی ایسی بھی ہے

فضا نم زدہ ہے
ہوا نوحہ گر
رات ڈھلتی ہے
اور وقت کٹتا نہیں
کاغذی پھول خوشبو کے خوابوں میں گم ہے
دیا رہگزاروں میں جلتا نہیں
کچھ بدلتا نہیں
دُور تک خالی رستہ ہے
رستے پہ پیڑوں کے کالے بدن
رات کو رات کہتے ہوئے ڈر رہے ہیں
اسی راستے پر
اندھیرے میں خود کو چھپائے

بہت خوبصورت مکانوں کے
مضبوط دیوار و در میں مقید
بہت تیرہ و تار رُوحیں
بدن کی قبا چاہتی ہیں
خط و خال کی روشنی چاہتی ہیں
کہ یہ اپنی آنکھوں سے
تاریکیوں کی گزرگاہ کو
دیکھنا چاہتی ہیں

Environmental Hazard

ابھی بیج بویا ہے
پہلے ہری شاخ پھوٹے گی
پھر سالہا سال مٹی سے موسم کے رشتے کی نسبت سے
پھول اور پھل آئیں گے
بیج کو شاخ سے پیڑ ہونے میں کتنے ہی موسم لگیں گے

اُدھر ننھے پھولوں کے پہلو میں
نم گھاس پر
جو تنا پیڑ کا
جڑ سے اُکھڑا ہوا، خم پڑا ہے
ابھی جو گرا ہے
یہ اس کی جڑیں تھیں
جو مٹی میں رستہ بناتے ہوئے

فرش و دیوار و دَر کاٹ کر
مجھ میں پیوست ہونے لگی تھیں
مری ذات کے خستہ دیوار و دَر کو ہلانے لگی تھیں

مرا کام بس اس قدر ہے کہ میں
ایک گھر کی حفاظت کروں
اور پرانے درختوں کا نوحہ لکھوں

اعتراف

سُورج ڈھلنے کی ساعت میں
ہم نے دیا جلایا کب تھا
اتنا بوجھ اُٹھایا کب تھا
وقت کی دُھندلی دیواروں پر
پورا نقش بنایا کب تھا
خوف کے جنگل کب کاٹے تھے
پَل پَل بڑھتی خاموشی کے
دل میں تیر چلایا کب تھا
انھو نے خوابوں کی گٹھڑی کب کھولی تھی
سُورج چاند ستارے مٹھی میں بھرنے کا
تجھ کو راز بتایا کب تھا

ہم تیری خاطر زندہ ہیں
تجھ کو یاد دلایا کب تھا
مٹی، تیرے غم کو ہم نے
اپنے دل سے لگایا کب تھا

آج چہرہ ہے تو کل نام ہے

آج چہرہ ہے
تو کل نام ہے
اور پھر کچھ لفظ
کوئی شعر، کہانی، کوئی مضموں
کوئی تصویر، کوئی ساز
مقولہ
کوئی دریافت کہ ایجاد
کوئی بات
کسی شہر کی دیواروں پہ لکھی ہوئی
ہونٹوں سے ادا ہوتی ہوئی بات کا مقصود ہے کیا
کون خالق ہے
کہاں ہے

اُسے معلوم ہے کیا
اُس کے شب و روز کا دُکھ
اُس کی خلش
کس کے تصرف میں ہے اب
راکھ اس کی کسی مٹی میں
کسی دشت
کسی موج میں
صدیوں کا سفر کرتی ہے
اور آ کے ٹھہرتی ہے کہاں---
چند اوراق میں ناموں کا ہجوم،
جن کے آزار کا رشتہ
تو مری ذات سے بھی ہے شاید
اور میں
اپنی بنائی ہوئی دُنیا میں مگن
اس تعلق پہ ہوں مغرور بہت
شہر میرا بھی ہے مدفون کہیں
وقتِ معلوم کی آنکھوں سے کہیں دُور بہت
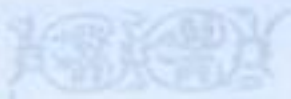
کتنی باتیں کھو گئیں.....

کتنی باتیں کھو گئیں میری
اندھیرے میں
بڑی گہری اُداسی میں
ستاروں کے دُھندلکے میں کوئی رستہ سا بنتا ہے
مگر جب غور سے دیکھو
تو اس میں زندگی کی دُھول اُڑتی ہے
ستاروں کو ستاروں سے ملانا کتنا مشکل ہے
کہ رستے بیچ میں دم توڑ دیتے ہیں

دھڑکتی سانس لیتی زندگی
لمحوں کے پیچھے بھاگتی ہے، ہار جاتی ہے
دلوں میں پھوٹنے والی

کوئی تازہ کلی سی بات
مردہ، سرد ماضی کی طرح دم سادھ لیتی ہے
عبادت سجدہ گاہیں ڈھونڈتی ہے
آخری تسکین کی خاطر
محبت منہ چھپاتی ہے

کسی گمنام گوشے میں
کوئی شاعر
کوئی تمثال گر
مٹی کے آدھے پیکروں پر
آدھی نظموں پر
کوئی عنوان لکھتا ہے
کسی کا نام لکھتا ہے

پہلی زیارت

آگ کے اندر نُور کے چشمے بہہ نکلے تھے
میں دم سادھے
اک سچائی ڈھونڈ رہی تھی
دُکھ کی جانی پہچانی لہروں کے اندر ڈُوب رہی تھی
اپنے آپ سے اوب رہی تھی
میں نے دیے کی صورت بُجھ کر
اپنی آنکھیں
اُس روزن میں گروی رکھ دیں
جس پر پورے چاند کے منظر کو کھُلنا تھا
اور پھر میں اپنی آنکھوں کو بھُول گئی
جب رات بڑھی
تو جسم کا پتھر ڈھو کر میں نے

اک جوہڑ میں پھینک دیا
اور چُپ کے جنگل میں جا بیٹھی

جس بَن باس پہ کہرا پھیلا
یگ بیتے
سنّاٹے گونجے
اُس بَن باس پہ
آج اچانک
خواب نے اک دروازہ کھولا
آسمان کے پھیلاؤ میں
ماہِ مبیں پر
خطِ جلی میں
ایک عبارت
اُجلی سچی مست اور کامل
پورے نُور میں ڈھل کر اُبھری

روزن میں رکھی آنکھوں کو
میں نے خواب سُنایا
انہیں رُلایا

آنکھوں نے دَم دَم دُہرایا
ماہِ مبیں پر
خطِ جلی میں
ایک عبارت
اسمِ علیؑ کی پہلی زیارت!
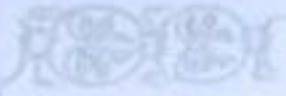
نہ جانے کس دُعا سے بند ٹوٹا
کُھلا رستہ کُھلا دریا کا پانی

کسی گوشے میں آنسو کا ٹپکنا
یہی تخلیق کی پہلی نشانی

غزلیں

میں جب چاہوں زمینِ دل پہ فصلِ گُل اُتر آئے
مرے ماتھے پہ سُورج ہے مرے ہاتھوں میں بادل ہیں

قیاس و یاس کی حد سے نکل کر
چلی جاؤں کہیں چہرہ بدل کر

اُڑے گی راکھ پھر میری ہوا میں
سُبک رفتار ہو جاؤں گی جل کر

میں سورج کے تعاقب میں رہوں گی
طلوعِ صبح ہو جاؤں گی ڈھل کر

طلسمِ مہر و مہ کو توڑ ڈالے
زمیں اپنی حرارت سے پگھل کر

ابھی پہلا قدم طے کر رہی ہوں
دوبارہ گر پڑی تھی میں سنبھل کر
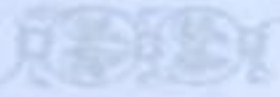
رہیں پھولوں بھرے رستے سلامت
سفر کاٹوں گی انگاروں پہ چل کر

مرے عطار نے خوشبو بنائی
بہت معصوم پھولوں کو مسل کر

ہوا کہتی ہے مجھ سے یہ سفر اچھا نہیں ہے
مسلسل دل میں انہونی کا ڈر اچھا نہیں ہے

کہیں پر دَر بنانا اور کہیں دیوار اُٹھانا
تضاد ایسا ہو جس میں وہ ہُنر اچھا نہیں ہے

بنے بھی خواب ہی میں جو بسے بھی خواب ہی میں
وہاں آسیب رہتے ہیں وہ گھر اچھا نہیں ہے

پرانی بستیاں اچھی ہیں یادوں سے بھری ہیں
مگر ہر روز کا ان میں گزر اچھا نہیں ہے

جڑیں جس کی گھروں کے آنگنوں تک پھیل جائیں
پسِ دیوار و دَر ایسا شجر اچھا نہیں ہے

اسے کاغذ پہ بنا دیتی ہوں
شہر کو آگ لگا دیتی ہوں

لو، جھپکتی نہیں آنکھیں اپنی
انہیں پتھر کا بنا دیتی ہوں

جب بھی ساحل پہ نظر آتے ہو
ریت میں رنگ ملا دیتی ہوں

پھر مجھے رات کڑی لگتی ہے
جب چراغوں کو جلا دیتی ہوں

بھر کے آنکھوں میں سمندر اپنا
اسے صحرا کی ہوا دیتی ہوں

انہیں بتلاتی ہوں جنگل کا پتہ
اور پرندوں کو اُڑا دیتی ہوں

بات کہنے کو تو کیا ہوتی ہے
پوچھتے ہو تو بتا دیتی ہوں

دیکھ لیتی ہوں تماشا اپنا
اور پھر پردہ گِرا دیتی ہوں

کیا ہوا کوئی سوچتا بھی نہیں
اور کہنے کو کچھ ہوا بھی نہیں

جیسے گم ہو گئی شناخت مری
اب کوئی مجھ کو ڈھونڈتا بھی نہیں

جس سے رہنے لگے گِلے مجھ کو
وہ ابھی مجھ کو جانتا بھی نہیں

ایسا خاموش بھی نہیں لگتا
اور کچھ منہ سے بولتا بھی نہیں

چاہتا ہے جواب بھی سارے
اور کچھ مجھ سے پوچھتا بھی نہیں

مسترد بھی کبھی نہیں کرتا
وہ مری بات مانتا بھی نہیں

داد دیتا ہے جیتنے پہ مجھے
اور کبھی مجھ سے ہارتا بھی نہیں

خواب تک میرے چھین لیتا ہے
اور کچھ مجھ سے مانگتا بھی نہیں

اُس طرف سب چراغ جلتے ہیں
جس طرف کوئی راستہ بھی نہیں

رات دن پر محیط ہے تو رہے
روشنی کوئی چاہتا بھی نہیں

ڈُوبتے آفتاب کی جانب
دیر تک کوئی دیکھتا بھی نہیں

اُفق تک میرا صحرا کھِل رہا ہے
کہیں دریا سے دریا مل رہا ہے

لباسِ ابر نے بھی رنگ بدلا
زمیں کا پیرہن بھی سِل رہا ہے

اسی تخلیق کی آسُودگی میں
بہت بے چین میرا دل رہا ہے

کسی کے نرم لہجے کا قرینہ
مری آواز میں شامل رہا ہے

میں اب اُس حرف سے کترا رہی ہوں
جو میری بات کا حاصل رہا ہے

کسی کے دل کی ناہمواریوں پر
سنبھلنا کس قدر مشکل رہا ہے

میں نے مضموں کے معانی کو بدل کر دیکھا
اَبر تخلیق کیا آگ میں جل کر دیکھا

فرش سے عرش تلک رستہ بنایا میں نے
اور کچھ دُور تلک اس پہ بھی چل کر دیکھا

جست بھر فاصلہ بھی طے نہیں ہونے پایا
حدِّ رفتار سے آگے بھی نکل کر دیکھا

یہ الگ بات مجھے اُس سے توقع کیا تھی
میں نے پھر جس کی طرف خود کو بدل کر دیکھا

مری دُنیا سے سوا بھی کوئی دُنیا تھی کہیں
اپنے سُورج کی طرح میں نے بھی ڈھل کر دیکھا

وہی منظر تھا نگاہوں میں ٹھہرنے والا
برف نے دھوپ کے موسم میں پگھل کر دیکھا

درمیاں جو دیوں کے اندھیرا ہے اس میں قدم لڑکھڑائیں تو کیا کیجیے
غم سے مانوس ہونے کے لمحے میں وہ راستہ بھول جائیں تو کیا کیجیے

روشنی ہی اندھیرے پہ حاوی نہ ہو پائے اور کوئی چہرہ نمایاں نہ ہو
مہر و مہتاب بھی جب زمیں پر اُتر کے فقط خاک اُڑائیں تو کیا کیجیے

جلنے بجھنے کی ترتیب پر تیز رَو سر پھرے موسموں کا اجارہ رہے
حوصلہ ایک لَو کا ہوائیں اگر بار بار آزمائیں تو کیا کیجیے

ہر طرف سرد پانی ہو اور دفعتاً سرد پانی میں لاکھوں دیے جل اُٹھیں
پھر بھی ساحل کو چُھونے سے پہلے ہی سب کشتیاں ڈُوب جائیں تو کیا کیجیے

دُور پربت، سمندر کے اُس پار سے آنے والی ہواؤں نے ہنس کے کہا
جب مصور کسی دیرپا نقش کو خود بنا کے مٹائیں تو کیا کیجیے

جُھوٹ اور سچ میں جب فاصلہ ہی نہ ہو رات اور دن کی حد پر کہانی رہے
راز کھل جائے اور پھر بھی سب چُپ رہیں اور باتیں چھپائیں تو کیا کیجیے

ہاتھ جن کو امیں کر دیا آنے والے زمانے کے خوابوں کی تعبیر کا
خام زہریلی دھاتوں سے رنگین دلکش کھلونے بنائیں تو کیا کیجیے

ستارے چاہتے ہوں گے یہ سلسلہ نہ ملے
مری دُعا سے کسی اور کی دُعا نہ ملے

ہزار کوس چلیں اور پلٹ کے آئیں وہیں
مسافروں کو کوئی شہر دُوسرا نہ ملے

یہ کیا کہ ذہن کو آسُودگی ملے نہ کبھی
تمام زخم بھرے جائیں اور شفا نہ ملے

یہ کیا کہ چاند ستارے ہوں راہ میں حائل
چراغ ہاتھ میں ہو اور راستہ نہ ملے

یہ کیا کہ وقت کے منظر بھی شب زدہ ہوں سبھی
یہ کیا کہ خواب کو آنکھوں میں بھی جگہ نہ ملے
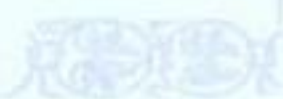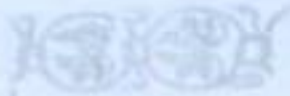
کہیں مکان و مکیں آندھیوں کا رزق بنیں
کہیں چراغ جلانے کو بھی ہوا نہ ملے

سحر کے وقت بھی آنکھوں میں اعتبار نہ ہو
جو لوگ جاگ رہے ہیں انہیں سزا نہ ملے
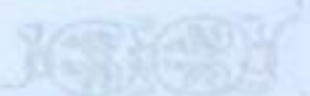
کہیں اک شہرِ بے قیدِ دَر و دیوار بھی ہو
کبھی ہم ساتھ ہوں اور راستہ ہموار بھی ہو

ضروری تو نہیں ہے منزلیں سب ایک سی ہوں
جو موسم اِس کنارے ہے وہی اُس پار بھی ہو

زمیں اور آسماں دونوں ہوں اپنی دسترس میں
نظر کا دائرہ ثابت بھی ہو سیّار بھی ہو

یہی دل، جبر کی وحشت سے جو بپھرا ہوا ہے
یہ خود محکوم ہو جائے اگر مختار بھی ہو

یہ سب را ہے دورا ہے خود بنا رکھے ہیں ہم نے
کہ ہم خود چاہتے ہیں زندگی دُشوار بھی ہو

دوبارہ اب سفر ہو گا کہاں میرا
وہ آئے روک لے رستہ یہاں میرا

ابھی کچھ دیر ہے سُورج کے ڈھلنے میں
ابھی تو اور ہو گا امتحاں میرا

ابھی تو ڈُھونڈنے کا کھیل باقی ہے
ابھی تو گم ہوا ہے آسماں میرا

ابھی میرے لہو میں بھی حرارت ہے
ابھی ناراض ہو گا بدگماں میرا

ابھی کردار کتنے اور ہیں اس میں
مجھے بتلائے محوِ داستاں میرا

قدم میرے ابھی سطحِ زمیں پر ہیں
ابھی ہو گا کسی دل میں نشاں میرا

ثواب و صبر کی منزل سے بھی گزری
اثاثہ بھی ہوا ہے رائیگاں میرا

کھِل اُٹھا پی کر زہراب
پتّی پتّی ایک گلاب

اُتنا ہی مضبوط ہوئی
جتنا ٹوٹ کے بکھرے خواب

مشکل ہو گئی مرے لئے
سیدھی سادی ایک کتاب

ایک قدم کی بھُول ہوئی
سارا رستہ ہوا خراب

کس کا آنگن کچا تھا
کس کو لے ڈُوبا سیلاب
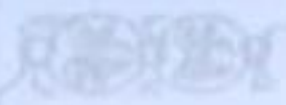
اُس کے مخاطب اور ہوئے
میرے دل کا وہی جواب

رات کی پہلی منزل میں
اُبھرا، ڈوب گیا مہتاب

تمہارے بعد کب لمحہ کوئی شب تاب دیکھا
نہ ویسی نیند آئی پھر نہ ویسا خواب دیکھا

مقامِ کشف پر کھُلنے لگے اسرار کیسے
میں جس دریا میں ڈُوبی تھی اُسے پایاب دیکھا

پھر اپنی آنکھ میں چڑھتا ہوا دیکھا سمندر
اور اپنی دسترس میں گوہرِ نایاب دیکھا

دہکتی دُھوپ ہی دیکھی نہ دیکھی تاب میری
کسی کی آنکھ نے چہرہ مرا شاداب دیکھا

اُمڈتا ابر ہی دیکھا نہ چڑھتی موج دیکھی
اُٹھے سو کر تو سارا شہر زیرِ آب دیکھا

پھر اُس سے سبزہ و گل کی بھی ہم نے آرزو کی
زمیں تشنہ رہی ہم نے اُسے سیراب دیکھا

کہاں وہ آنکھ جس نے صرف گہری رات دیکھی
کہاں وہ آنکھ جس نے ڈوبتا مہتاب دیکھا
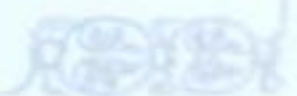
کہاں گھومتی چلی جا رہی ہے یہ رہگزر
ابھی رات ہے ابھی صبح ہے ابھی دوپہر

ابھی نقش کوئی بنا ہی تھا مری آنکھ میں
کہ اُلجھ گیا مرے خواب سے مرا خواب گر

تو یہ ابر ہے جو لپٹ رہا ہے نگاہ سے
کوئی بات ہے جسے کہہ نہ پائے گی چشمِ تر

مرے خط و خال سنوار کر نہ بگاڑ دے
مرے اعتبار کا منتظر مرا نقش گر

وہ کسی کے ساتھ ہے اور ہے مرے ساتھ بھی
میں عجیب ہوں کہ عجیب ہے مرا ہم سفر

کوئی حرف ہے جو کسی کتاب میں بھی نہیں
کوئی عہد ہے جو لکھا گیا ہے ہواؤں پر

کسی آنے والے مقام پر ہیں وہ ساعتیں
جنہیں یاد رکھے گی زندگی بھی گزار کر

انھی جنگلوں سے اُڑان کا مجھے زعم تھا
انھی جنگلوں پہ بکھر گئے مرے بال و پر

خلش ہے خواب ہے آدھی کہانی ہے
ہماری بات تو بس آنی جانی ہے

سمندر سے تمہیں وحشت ہے کیوں اتنی
اسے چُھو کر تو دیکھو صرف پانی ہے

میں کچھ بھی پوچھ لوں کیا فرق پڑتا ہے
تمہیں تو بات ہی کوئی بنانی ہے

ذرا بتلاؤ تم کس کس سے ملتے ہو
تمہارے شہر میں کتنی گرانی ہے

تمہیں دُنیا سے مطلب ہے مجھے تم سے
تو پھر یہ کس طرح کی ہم زبانی ہے

ہم اِس پہلو سے بھی تو سوچ سکتے ہیں
ستارہ رات کی پہلی نشانی ہے
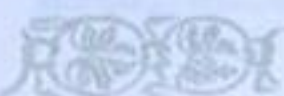
زمیں کو آتے جاتے موسموں سے کیا
اسے تو آگ مٹی سے بجھانی ہے

سبھی ہیں سرخرو اپنی عدالت میں
کسی نے کب کسی کی بات مانی ہے

آج بھی کل کی طرح خود سے ملاقات رہی
برسرِ ذکر تمہاری بھی کوئی بات رہی

کس طرح صبح کی آہٹ سے دریچے کھلتے
گھر کے اندر تو بہت دیر تلک رات رہی

در و دیوار کو دھلوایا، سجایا میں نے
اور کسی دُوسرے گھر خواب کی بارات رہی

پہلے زندانِ طلسمات بنایا مجھ میں
پھر کسی اور نشانے پہ مری ذات رہی

کیسے اُلجھے ہوئے ہر بات کے معنی نکلے
اور ارادت کی گھڑی وقفِ سوالات رہی

یہ تو اچھا ہوا مڑ کر نہیں دیکھا میں نے
کھیل کے بیچ تعاقب میں مرے، مات رہی
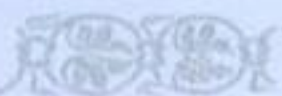
زرد پتّے بھی برستے رہے بوندوں کے ساتھ
اب کی پت جھڑ تو مرے شہر میں برسات رہی

اسی تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں کہیں
موج بہتے ہوئے دریا کی مرے ساتھ رہی

تمہیں میں یاد رکھوں اور مجھے تم بھول جاؤ
چلو یونہی سہی اب برف میں رستہ بناؤ

اُجالے کے نئے خوابوں کی لَو مدھم بہت ہے
بُجھا بیٹھے ہو جن کو اُن چراغوں کو جلاؤ

مجھے بتلاؤ موت اور زندگی میں فرق کیا ہے
میں مرنا چاہتی ہوں تم مجھے جینا سکھاؤ

میں اب اپنے لہو سے اپنا چہرہ دھو رہی ہوں
تم اپنے آئینے سے گرد کی چادر ہٹاؤ

بڑی مدت سے میں اک معجزے کی منتظر ہوں
مجھے پانی میں ہی مہتاب کا چہرہ دکھاؤ

مرے اطراف گھرے جنگلوں کی سائیں سائیں
اسی سے بھرتی جاؤں گی تمہاری چُپ کا گھاؤ

رواں پانی پہ لکھو آج سے اپنی کہانی
صحیفہ زندگی کا تیز دریا میں بہاؤ

ریت پر ناؤ چلاؤ مجھے کیا
اسے پانی میں بہاؤ مجھے کیا

صبح کو رات میں تبدیل کرو
رات کو صبح بناؤ مجھے کیا

قلعے تعمیر کرو اپنے لئے
کوئی دیوار گراؤ مجھے کیا

دستکیں دیتے پھرو چشم بہ چشم
کسی کے خواب میں آؤ مجھے کیا

کم کرو اور بھی معیارِ وفا
اپنی قیمت بھی گھٹاؤ مجھے کیا

راکھ کے ڈھیر پہ بیٹھی ہوں میں
اب کسی گھر کو جلاؤ مجھے کیا

سوگئی اوڑھ کے میں خاک اپنی
شور سا شور مچاؤ مجھے کیا

ایک چھوٹی سی بات دھیان میں ہے
کتنی تلخی مری زبان میں ہے

ایک موسم پرائی دُنیا کا
ایک موسم مرے مکان میں ہے

آخری شام اور صبح تلک
آخری رات درمیان میں ہے

کچھ پرکھنے میں پوچھنے میں نہیں
جھوٹ اور سچ مرے بیان میں ہے

آنکھ کی بات آنکھ کی حد میں
بات جو اصل ہے گمان میں ہے

کون ہو جو مری طرح بتلائے
فرق کیا جسم اور جان میں ہے

آج اُونچا ہے آسمان بہت
آج وحشت مری اُڑان میں ہے

ایک میری زمین پر روشن
اور اک شہر آسمان میں ہے

کچھ نہیں لکھا جاتا ہے
وقت گزرتا جاتا ہے

جتنا چلتی جاتی ہوں
رستہ بڑھتا جاتا ہے

کیسے رنگ پہنتی ہوں
یہ بھی دیکھا جاتا ہے

کیسے باتیں کرتی ہوں
یہ بھی سوچا جاتا ہے

پھر میری خاموشی کا
مطلب پوچھا جاتا ہے

میرا کوئی نام نہیں
مجھے بتایا جاتا ہے

انگلی تھامی جاتی ہے
اور بھٹکایا جاتا ہے

بارش تھمتی جاتی ہے
کہرا جمتا جاتا ہے

ساگر بھرتے جاتے ہیں
دریا بہتا جاتا ہے

کیسے ٹھنڈے ہاتھوں پر
موم پگھلتا جاتا ہے

میرے سانس کی گرمی سے
موسم مرتا جاتا ہے

سمت ہی اور تھی وہ دھیان جدھر تھا اُس کا
سانحہ ہونے سے پہلے مجھے ڈر تھا اُس کا

کس طرح حد کوئی رستے کی مقرر ہوتی
کئی حصوں کئی خانوں میں سفر تھا اُس کا

در و دیوار کی مٹی کو لہو دے کر بھی
طے یہ ہونا تھا کہ میرا تھا نہ گھر تھا اُس کا

کوئی ابہام کا پردہ تھا مری آنکھوں پر
اور خم اپنی ہی تائید میں سر تھا اُس کا

میں نے جو بات کہی وجہِ ندامت ٹھہری
مجھے اِس سطح پہ لانا بھی ہُنر تھا اُس کا

اپنی تعمیر کے پیچیدہ مراحل میں ہوں
ایک مدت سے تضادات کی منزل میں ہوں

اپنی ہی ذات سے پیمان نبھانے کے لئے
ایک کے بعد کسی دُوسری مشکل میں ہوں

صرف اپنے لئے تکمیل کی ضد ہے ورنہ
نہ کسی آنکھ کی لَو میں نہ کسی دل میں ہوں

مجھے زنداں کی فصیلیں نظر آئیں کیسے
میں تو اُلجھی ہوئی نادیدہ سلاسل میں ہوں

ابر تاخیر سے پہنچا ہے مری مٹّی پر
بے نمو بوئی ہوئی فصل کے حاصل میں ہوں

ایک سفّاک سمندر ہے مرے چاروں طرف
اور میں ہوں کہ خیالِ مہِ کامل میں ہوں

اتنے آسودہ کنارے نہیں اچھے لگتے
ایک ہی جیسے نظارے نہیں اچھے لگتے

اتنی بے ربط کہانی نہیں اچھی لگتی
اور واضح بھی اشارے نہیں اچھے لگتے

ذرا دھیمی ہو تو خوشبو بھی بھلی لگتی ہے
آنکھ کو رنگ بھی سارے نہیں اچھے لگتے

پاس آ جائیں تو بے نوری مقدر ٹھہرے
دُور بھی اتنے ستارے نہیں اچھے لگتے

اپنی گمنامی کے صحراؤں میں خوش رہتی ہوں
اب مجھے شہر تمہارے نہیں اچھے لگتے

نثری نظمیں

تھوک دی میں نے یہ نظم
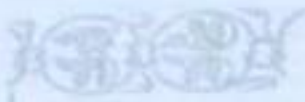
تھوک دی میں نے یہ نظم
لو چاٹ لو اِسے
اپنی لمبی زبان سے
میں نے صبر کیا
اور تمہارا نام بدل دیا
میں نے آگ پھانک لی
اور تمہیں سمندر نہ سمجھا
میں نے اپنے خاکستری رنگ پر غرور کیا
اور تمہارے خون کی رنگت پر ہنسی
پی لیا میں نے اپنا آنسو
اور سوکھ گئی صحرا کی طرح
کاٹ لی میں نے رات
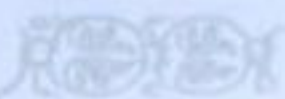
اور صبح کا انتظار نہ کیا
پھوڑ دیئے چراغ
اور جلا لئے ہاتھ اپنے
اُڑا دی اُن کی راکھ
ساتویں آسمان پر
جہاں سے کوئی پلٹ کر آنا نہیں چاہتا
سیپیوں سے موتی چُن کر
اُچھال دیئے میں نے سمندر میں
اور بھر لیں کانچ سے اپنی مٹھیاں
تم نے کبھی خالص خون کی رنگت دیکھی ہے؟
نہیں، یہ زخم نہیں
ڈھانپ دیا زخم کو
اور بھر دیا گھاؤ کو اپنے ہی گوشت سے
دان کر دیں اپنی آنکھیں
اور اپنے جسم کے ٹکڑوں سے
ایک اور انسان بنایا
اگر میں خُدا ہوتی
تو اس میں رُوح بھی پھونک دیتی!

کلام کیا

کلام کیا رب نے اپنے پیغمبر سے
کہ وہی کلام کے لائق تھا
اور چھوڑ دیا ہمیں بے آب و گیاہ

کلام کیا موت نے زندگی سے
اور کاٹ دی اس کی رگِ گلو
آزاد کیا اسے جسم سے
اور بے بہا کیا
اور تج دیا ہر بے جان کو

کلام کیا دن نے رات سے
کہ وہ اس کی ضد ہے

اور اس کے بغیر نامکمل
اور چُھو لیا خواب کا پیالہ
جو وجد میں تھا

کلام کیا خوف نے
ہلتے ہوئے ستون سے
جو بے جان تھا
مگر جاندار کا محافظ
اور ربطِ کلام بھُول کر
محو ہوا اپنے کام میں
ایک ایک کر کے سب عمارتیں زمیں بوس ہوئیں
اور سب انسان پہاڑوں کی طرف پلٹ گئے
زمین صاف ہوئی
اور رب نے پھر بشارت دی
اپنے خاص بندوں کو
اور کائنات کے نظام کو بحال کر کے

عرش نشیں ہوا

ہم نے کلام کیا ایک دُوسرے سے
اور خاموش ہو گئے
کہ ہم کتاب پڑھ چکے تھے
اور اس کے معانی سمجھ چکے تھے
اور ہمیں بچانے والا کوئی نہ تھا
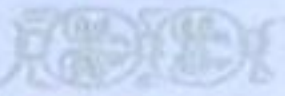
کوئی بات اُس کے وجود میں در آئی

کوئی بات اُس کے وجود میں در آئی
قحط اور خشک سالی کی طرح
اور دیکھتے ہی دیکھتے
آنکھوں کے گڑھے ہڈیوں سے بھر گئے
کوئی بات اُس کے وجود میں در آئی
کیکر کے جنگل کی طرح
اور اس کی انگلی سے خون بہا
کوئی بات اس کے وجود میں در آئی
رینگتے ہوئے جانور کی طرح
اور وہ جھرجھرائی
کوئی بات اُس کے وجود میں در آئی
جدائی کے گیت کی طرح

اور اس کے کانوں کے پردے مہین ہو گئے
آنکھیں شہد سے بھر گئیں
اس نے پیر کاٹ کے پہیے لگائے
اور تیار ہوئی

یہاں کوئی کسی کو کچھ نہیں دیتا
جو چھین لو وہ تمہارا
جو چھوڑ دو وہ کسی کا نہیں
جو سو رہا وہ سو رہا
جو جاگا وہ پھر نہ سویا
جو غیر وہ غیر
جو اپنا وہ بھی غیر

اس نے پہیے اُتارے
اور دوبارہ پیر لگائے
جدائی کا گیت وجود سے نکالا
رینگتے ہوئے جانور کو اُٹھا باہر پھینکا
کیکر کا جنگل کاٹا
قحط اور خشک سالی سے نکلی

کلمہ پڑھا اور پاک ہو کر
اِدھر اُدھر نظر دوڑائی
تو وہی دیکھا
جو دو سو برس بعد
پہاڑوں سے پلٹنے والوں نے دیکھا

بادل، تُو ہر موسم کا بادشاہ ہے

بادل
تو ہر موسم کا بادشاہ ہے
کیسا آزاد
کتنا بے باک ہے تو
کسی کے سُورج کو چھپاتا ہے
کسی کے چاند کو
اور ہماری بستیاں تو ذراسی پھوار ہی میں بہہ جاتی ہیں

بادل
ہم تجھ سے ڈرتے نہیں
ہم تو ہنسی خوشی اپنا گھر بار تیرے سپرد کر دیتے ہیں
تجھے ان نعمتوں میں شمار کرتے ہیں
جن کے لئے سورۂ رحمٰن نازل ہوئی

بادل
بستی کے کنارے ایک مکان ہے
اُس میں کوئی نہیں رہتا
اُس میں دُنیا کی ساری نعمتیں ہیں
ہم لوگ کھڑکیوں سے جھانک کر دیکھتے ہیں

بادل
اُس گھر کی دیواریں بہت پکی ہیں
اور کمرے بڑی بلندی پر
جب تو غصے سے گرجتا ہے
تو تیری پوری آواز اس مکان کے دالان میں بھر نہیں سکتی
جب تو غضب ناک ہو کر برستا ہے
تو تیرا پانی اس کے کمروں میں ٹھاٹھیں نہیں مارتا
مگر پھر بھی وہاں سے رونے کی آوازیں آتی ہیں
تب ہم سمجھتے ہیں
کہ گھر والے اپنے گھر کو لوٹ آئے ہیں

پانی پہ چلنا ہے تو

پانی پہ چلنا ہے تو
پانی میں ڈُوبنے کا تجربہ ہونا چاہیے
آگ کو چھُونے کے لئے
راکھ سے پیدا ہونا پڑے گا
محبت کو اپنے اُوپر طاری نہ کرو
یہ شراب نہیں
تیزاب ہے جو راہ چلتے منہ پہ پھینک دیا جائے---
خواہش بہت گرم ہے
اور جذبہ بہت سرد
اب انسان کے بطن سے بندر پیدا ہوگا
اور سب خوشیاں منائیں گے
اُدھار مانگے خواب

جیبوں میں رکھ کر اِترائیں گے---
ڈوب گئے ڈوبنے والے
اور راکھ ہوئے آگ سے کھیلنے والے
اب تم اکیلے کرتب دکھاؤ
اور تالیاں بجاؤ

کتاب کو حفظ کرو

کتاب سے غرض ہے
اور آنکھوں سے
باقی جسم کو سرد خانے میں رکھ دو
مقفل کر دو اسے
اور تب نکالو
جب کتاب حفظ ہو جائے

ایک نے زمین کی بات کی
دُوسرے نے آسمان کی
اور یک مشت فاصلہ طے ہو گیا
یہی ہوتا ہے پہلے پہل

جب زمین پر برف باری ہوتی ہے

اور آسمانوں پر عذاب نازل ہوتا ہے
تو زمین اپنا حساب دیتی ہے
اور آسمان اپنا

کتاب کو حفظ کرو
اور بار بار حفظ کرو
کہ امتحان کی گھڑی میں
کوئی لفظ بھُول نہ جائے

سچ یہ ہے کہ زمین آسمانوں میں تحلیل ہونے والی نہیں
نہ انسان، انسان میں
حالانکہ رُوحوں کے جسم نہیں ہوتے
نہ ان کے نام

کوئی خُدا کے خلاف نہیں
یہ محض دل کی آواز ہے
اور دل اس کا گھر
جس نے اسے بنایا!

اپنا اور اپنا چہرہ

پھُول بیچنے والے
کتابیں بیچ---
دُکانیں کتابوں سے بھر گئیں
اور نام کسی کا نہ ہوا
کتابیں کھول کے دیکھا
ورق خالی نہیں،
بھرے ہوئے،
پھولوں سے
تازہ پھول، باسی پھول
سرخ پھول، نیلے، سفید، کالے، ہریالے
کٹورے میں صندل کا پانی بھر کر چہرے پر لگایا
اور بیٹھی وہ پڑھنے

پڑھتے پڑھتے یگ بیت گئے
اور پہلا صفحہ ختم نہ ہوا
ہکلی ہو گئی گھر کو آنے والی گلی
اور مسافروں کو پلٹانے لگی
کوئی دہلیز نہ پھلانگ سکا
منڈیر کی بتی رات کے بعد
دن میں بھی جلی
کسی نے دیکھا ہی نہیں
رنگے دوپٹے الگنی پہ سوکھے
اور اوڑھے گئے
کچھ پتہ نہیں
بلیاں چوہوں کے پیچھے بھاگیں
تو وہ
بلیوں کے ساتھ چوہے پکڑنے لگی
چوہوں نے کتابیں جو کتر ڈالیں

پھول بیچنے والے نے صدا لگائی
تو وہ کانچ کی ہو گئی

گھر سونا ہو گیا
تڑخے ہوئے آئینے کو اس نے صاف کیا
آئینے میں دو چہرے تھے
ایک اس کا اپنا
اور دُوسرا بھی اپنا

چراغوں والی!

چراغوں والی!
رات سے ڈر
تو جانتی ہے تیرا کوئی خُدا بھی ہے
یہ بانس کا جنگل ہے
اس میں تنکا تنکے کو سجھائی نہیں دیتا
آنکھیں بنانے والے سے منکر نہ ہو
اندھے کی بددُعا نہ لے

چراغوں والی!
شہر سے ڈر
تو جانتی ہے تیرا کوئی والی بھی ہے
پکی سڑکیں پگڈنڈیوں جیسی نہیں ہوتیں

یہ بجھے بجھے کالی ہو جاتی ہیں
راستہ نہیں بدلتیں

چراغوں والی!
خواب سے ڈر
تو جانتی ہے تیرا کوئی موسم بھی ہے
درختوں کی چھاؤں آدھی ہو جائے
تو رُوپ جھڑ جاتا ہے
اور سوچنے والی کی قیمت پوری نہیں لگتی

چراغوں والی!
موت سے ڈر
تو جانتی ہے تیرا کوئی ہمزاد بھی ہے
جینے کا ہوکا ہو جائے
تو جان نہیں نکلتی
ایک، دُوسرے کو کھینچتا ہے
اور جان نہیں نکلتی

تنہائی کا وعدہ

مٹی بانجھ نہیں تھی
ہریالی نے وہ دھوم مچائی
کہ پانی سوکھ گیا
اور بچے اناج کو ترس گئے
جن کے گھروں کے دالانوں میں اناج اُگتا ہے
وہ کسی اور چیز کو ترستے ہیں
بلّی کو دُودھ ملے
تو چھیچھڑے مانگے
چھیچھڑے ملیں تو کوؤں کو نوچ کھائے

مٹی کو اچھوت کی بیماری لگی
بنجر زمینوں کی بددُعا کی طرح

جہاں ہل جوتنے والے لاغر تھے
وہاں لاغر کی مدد کو لاغر ہی پہنچا
اور اس سے کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا
کوّے چونچوں سے مٹی کھودتے اور کائیں کائیں کرتے

سب اپنا اپنا گناہ لے کے آئے
کہ مٹی میں دفن کریں
اسے دان دیں
ایک ٹکڑا رات کا
ایک دن کا
بیٹی کی نحوست کا ماتم
بُزدلی کا روگ
کم علمی کا سوگ
مگر کچھ بھی نہ ہوا
پوار جھوٹ آدھے سچ سے نہیں بُجھتا
اپنا اپنا گناہ دفن کر کے
سب دُوسری زمینوں کی طرف نکل گئے---
صبر کرنے والے کو بُھوک اور پیاس کم لگتی ہے

مگر کون مانے
وہ لوگ بھی تو تھے جنہوں نے وعدہ کر کے زبانیں کاٹ لیں
مٹی سے وعدہ کر کے مکرنے والا زیادہ کریہہ ہے
کہ یہ وعدہ تنہائی کا وعدہ ہے
اور تنہائی کا وعدہ اپنے آپ سے ہے

بہت ہوتے ہیں سات دن

مجھے اسی ایک لحظے میں سب کچھ کرنا ہے
مجھے اسی ایک لحظے میں کائنات تخلیق کرنی ہے
میرے رب نے کہا
اور سات دنوں کو گرہ لگا کر ایک لمحے میں تبدیل کر دیا

بہت ہوتے ہیں سات دن
سات دنوں میں کائنات تخلیق ہو سکتی ہے
تو سات دنوں میں جذبے کیوں پروان نہیں چڑھ سکتے
پوری نفرت
یا پوری محبت

سات ضرب چار
اور سات ضرب سات

ہم وقت کو ایسے ناپتے ہیں اور تھک جاتے ہیں
کافی ہوتی ہے اتنی زندگی
ایک بات سمجھنے کے لئے
کافی ہوتی ہیں اتنی راتیں
چور کے ترکش سے تیر نکالنے کے لئے
کافی ہوتا ہے اتنا ساتھ
بار بار زندہ رہنے کے لئے

Feminist

چار بچوں کی ماں کی آبرُو ریزی کرنے والا
کتنی دیر مطمئن رہا؟
ہیروں کا برادہ پھانکنے والی عورت نے کہا:
بھُوک کا کنواں کیسے بھرتا ہے؟

سب راستے غلط راستے ہیں
لاؤڈ سپیکر سے آواز بلند ہوئی
آدھی رات کو نیند ٹوٹ جائے
تو دن بھر نیند آتی رہتی ہے
لُو کے تھپیڑوں میں مزدوری کرنے والی
ٹھنڈے کمرے میں
ہیروں کا برادہ پھانکنے والی کے پاؤں دابتی ہے تو اُونگھ جاتی ہے

میلے کچیلے بچے
باغ میں بے تکان کھیلتے ہیں
اور شام کو مر جاتے ہیں

سب کہہ رہے ہیں
گیدڑ کے منہ کو خون لگ گیا ہے
اور چڑیا کی بُھوک مر گئی ہے
گوشت خوروں نے سب چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے
یک طرفہ جنگ کتنی دیر تک لڑی جاتی ہے؟

ایک عورت روز صبح جلوس نکالتی ہے
اور شام کو گیدڑ کو سونگھتی ہوئی چوپایہ بن جاتی ہے
ایک عورت دن بھر ہیروں کا برادہ پھانکتی ہے
اور رات کو بُھوکی سو جاتی ہے

وہ روئی

وہ روئی
کہ شہتوت اور لوکاٹ کے پیڑوں پہ جھولنے والی
پاؤں پاؤں چلنے لگی
اس کی ماں نے اوروں کا منہ کالا کیا
اور اپنی بیٹی کو ڈرایا
وہ روئی
کہ وہ خود کو خوبصورت لگی
اور اس نے اپنے بھائی کو مارا
وہ روئی
کہ اس کے بچے نے
اس سے نفرت کی نہ محبت
وہ روئی کہ وہ شکر گزار نہ ہوئی

اور اس کا ہاتھ سُوکھ گیا
وہ روئی
کہ اس نے ظلم کیا
اور جان لیا
کہ بیٹیاں ظلم کر سکتی ہیں
اور بیٹے بھی مظلوم ہوتے ہیں

ماں! اتنی محبت نہ کرو

ماں
تم نے جس بچے کو تنہائی میں جنا
وہ جوان ہو کر بوڑھا ہو گیا ہے
تم نے ابھی تک اس کا نام نہیں رکھا
اُٹھ جاؤ ماں
سُورج سوا نیزے پر آ گیا ہے
اب شام ہو جائے گی
اور کُتے بھونکیں گے
کتوں کے چہرے کتوں جیسے نہیں ہوں گے
ان کے حلق سے اور کتے برآمد ہوں گے
جشن ہوگا
ماں اُٹھ جاؤ

تمہارے بچے کو بُھوک لگی ہے
وہ کاغذ کے ٹکڑے چبا رہا ہے
وہ مٹی پھانک رہا ہے
آنکھیں بند کر کے دیکھو
راستہ کہاں تک جاتا ہے
دل میں پلٹ کے دیکھو
اس میں باجا نہیں
مقتول کی چیخ بھی ہے

ماں
اتنی محبت نہ کرو
کہ تمہاری بینائی بھی سلب ہو جائے اور سماعت بھی
ماں
کتے آ گئے ہیں
تمہارے بچے کے منہ سے رال ٹپک رہی ہے!

اُس اذیت کو کبھی نہ بھُولنا

اُس اذیت کو کبھی نہ بھُولنا
جس میں باپ ماتھا چوم کے
اجنبی بن جاتا ہے
اور بیٹی اس کے تحفے کا انتظار کرتی رہتی ہے

اُس اذیت کو کبھی نہ بھُولنا
جس میں مرنے والے کا چہرہ مسخ ہو جاتا ہے
اور اس کے بیٹے
اُسے پہچان نہیں سکتے

اُس اذیت کو کبھی نہ بھُولنا
جس میں سب زندہ رہتے ہیں

اور ایک دُوسرے کی سانسیں گنتے ہیں

اُس اذیت کو کبھی نہ بھُولنا
جس میں خون کی شریانوں سے دُودھ بہتا ہے
اور ماں پیدا ہوتی ہے

اُس اذیت کو کبھی نہ بھُولنا
جس میں ماں کی مشقت کا احسان
بیٹے اُٹھاتے ہیں
مگر دراصل احسان فراموش ہوتے ہیں

اُس اذیت کو کبھی نہ بھُولنا
جس میں تم اپنے آپ کو دریافت کرتے ہو
اور دُوسروں سے اپنا نام پوچھتے ہو

اُس اذیت کو کبھی نہ بھُولنا
جس میں تم اپنے آپ کو ترک کرتے ہو
بے مائیگی تخلیق کرنے کے لئے

مورخ

شام کے ساڑھے پانچ بجے اور کچھ نہیں ہوا
ندی کے پانی کا شور بڑھا
اور یخ ہو گئی فضا
اس کی انگلیوں کی طرح
پہاڑی راستوں پہ چلنے کی عادت نہ ہو
تو منزل سرک سرک کے پیچھے ہٹتی جاتی ہے---
بانسری کی آواز سننے کو جی چاہے
تو آنکھیں بند کر لو
اور اس علاقے کی لوک کہانی میں داخل ہو جاؤ---
لڑکیوں کی ہنسی نے مورخ کے قدموں کو روکا
لوک کہانی اپنے انت کو پہنچی
اور کوئی زندہ نہ بچا---

کونسا بیج کہاں پر پھوٹا اور کہاں سُوکھ گیا
گوشت کھا کر بھی
جلے ہوئے پیڑوں پہ بور نہ آیا
جمے ہوئے خون میں گم سبزے کی قسم کھا کر کہتا ہے دیکھنے والا
اسے نہیں معلوم
آندھی کس طرف سے آئی اور کہاں پلٹ گئی

خواب ! دیکھ اُس آنکھ کی طرف

خواب !
دیکھ اُس آنکھ کی طرف
جس پہ تیرا پہرہ ہے
بنانے والے نے تجھے آنکھ کے ساتھ بنایا تھا
خواب !
دیکھ اُس شہر کی طرف
جو تیرا انتظار کرتا ہے
کیوں چلتا ہے سنبھل سنبھل کر
کہ آبلے نہ پڑ جائیں
تھوڑا غصہ ساتھ لے لے
اس سے قدم تیز اُٹھنے لگتے ہیں

آنکھ خواب کے ساتھ ساتھ بھاگتی ہے
اور شہر دُور ہوتا چلا جاتا ہے
بینائی کی کوئی حد مقرر نہیں
تم جس چیز کو چُھو لو گے
اس کی حد کا تعین ہو جائے گا
جو چیز تمہاری حد میں نہ ہوگی
اس کے بوجھ تلے دب جاؤ گے
اور خواب بڑا ہو جائے گا
آنکھیں ذہین ہو جائیں گی

چلو علم دینے والے سے علم مانگیں
اس سے پہلے
کہ خواب منزل کو چُھو کر
آبلے کی طرح پھُوٹ جائے
اور قدم رُک جائیں
ہم علم دینے والے سے علم مانگتے ہیں

وہ ایک ماں ہے

وہ ایک ماں ہے

رات

گاڑھے کڑوے سمندر جیسی
آنکھیں اس کی سطح پہ بہتی ہیں
صبح

گہرے نیلے جسم کی طرح
جس میں باقی تمام رنگ چھپ جاتے ہیں
دوپہر

کچے کھلونے کی طرح
جسے بچہ چُھو لے تو ٹوٹ جائے
اور چھین لیا جائے

تو اس کا خواب چیخ جائے

شام
رات کی آمد کا خوف سونگھتی ہے
مگر
وہ ایک ماں ہے
ماں پہر نہیں گنتی
ماں ڈرتی بھی نہیں
ماں جھوٹ بولتی ہے
اور زندہ رہتی ہے
زندہ رہنا بہت ضروری ہے

سب کچھ محفوظ کر لو

سب کچھ محفوظ کر لو
ایک ایک نقطہ
ایک ایک لفظ
انسانوں اور جانوروں کے اعضا
لکڑی کے ٹکڑے
ایک صندوق بناؤ ان سے
اور بھر دو اسے لفظوں سے اور جانداروں کے مردہ اعضا سے

بے معنی بات کر کے
اسے معنی خیز نہ بناؤ
بعض جال چالاکی سے بڑے ہوتے ہیں اور مسخرے بھی
پھر جب تم رونا چاہتے ہو تو تمہیں ہنسنا پڑتا ہے
اور جب تم ہنسنے ہو تو ڈھول بجتا ہے

اور ساری دُنیا سُنتی ہے

سُنا ہے لوگ دُنیا سے ڈرتے ہیں
جیسے تم اپنے آپ سے ڈرتے ہو
جیسے میں اپنے آپ سے ڈرتی ہوں
تم اور میں مل کر دُنیا بن جاتے ہیں
جیسے ایک اور ایک دو
اور دو اور دو آٹھ ہوتے ہیں

زیادہ باتیں نہ کرو
اگر زبان کٹ گئی
تو ان باتوں کو کون دُہرائے گا
زیادہ بوجھ نہ اُٹھاؤ
اگر کمر دوہری ہو گئی
تو اسے کون بانٹے گا
دھیرے دھیرے چلو
سرعت کا ہے کی
تمہارے پاس تمہارا ماضی ہے
اس صندوق میں
اور آنے والے کل کی باگ ڈور کسی اور کے ہاتھ میں ہے!

آج کی رات کا ہر خوف ہے مجھ سے منسوب
آج کی رات کوئی دُوسرا بیدار نہیں

اپنے ماحول سے مانوس نہیں ہیں اب تک
ہم کسی اور کہانی کے تو کردار نہیں

آدھا دن اور آدھی رات

(۱۹۹۶)

انتساب

مہر، حسن، سلمان اور احمد کے لیے

فہرست

خاکِ اسرار پر پاؤں کیسے رکھوں

آنکھ میں تیرتی
آس کی بوند میں
خواب در خواب کہرام ہے
دن کہاں جا ڈھلا
رات کو کیا ہوا
دسترس میں مرے شام ہی شام ہے،
اور تیری زمیں
آس کے ساحلوں کی صدا
نور کا سلسلہ
دُکھ کا اقرار بھی
سُکھ کا ادراک بھی
نیند کا سائباں

جاگنے کی جزا
فرش سے عرش تک
روشنی کی روش
تازگی کی ردا
خاکِ اسرار پر
پاؤں کیسے رکھوں
میرے سجدوں میں سورج، ستارے ٹکے
میری آنکھوں میں نیلے سمندر گھلے
میری راتوں میں صبحوں کے منظر کھلے
میری آواز کے زمزموں نے مگر
میرے سیال خوں کی گواہی نہ دی
میرے لفظوں نے بھی جو کہا جھوٹ تھا
لفظ کی لغزشوں میں
دُعا کی سکت ہی کہاں
لفظ مرہونِ صوت وصدا
لفظ کچھ بھی نہیں
اصل سچائی دل میں ہے
دل، تیری دہلیز پر
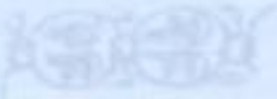
تیری دہلیز کی خاک پر
دل سے بہتا ہوا رنگ ہے
اس سیہ رنگ کو
اپنے گنبد سا سرسبز کر
ایک منظر بنا، ایک منظر بدل
اصل سچائی دل میں ہے
دل تیری دہلیز پر
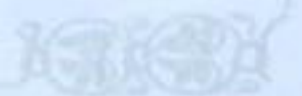
میرے آقاؐ کو خبر تو ہو گی

(مدینہ سے مکہ سفر کے دوران لکھی ہوئی نظم)

جب بھی یہ چاند اسی طرح اُبھرتا ہوگا
یہ ستارہ بھی یہیں پر ہوگا
شام کی گود میں پھیلے ہوئے کہسار
یہ مٹی یہ ہوا
ابر اور گرد کے پردے میں نہاں اور عیاں رنگِ شفق
آتشیں رنگ میں گم ہوتا ہوا تارِ اُفق

سوچتی ہوں
مرے آقاؐ کی سواری اسی رستے سے گزرتی ہوگی
خاک کے ذرّوں پہ اُڑتی ہوئی تقدیر سنورتی ہوگی
انؐ کی آنکھوں نے

یونہی ڈھلتی ہوئی شام کو دیکھا ہوگا
ربِ تخلیق کے اکرام کو دیکھا ہوگا

جانے وہ کون سا لمحہ ہوگا
وقت کی لوح کے کس پہر میں ٹھہرا ہوگا

میرے آقاؐ کو خبر تو ہوگی
اُس طرف قرنوں کی گردش سے پرے
اُسی لمحے کی کسی تہہ میں
کسی عکس،
کسی پرتو میں
اک گنہگار کی آنکھیں بھی وہی ارض وسما دیکھیں گی
اُسی لمحے کی کسی چاپ
کسی آہٹ میں
اُس کے لب خاک کو چُھونے کی اجازت لیں گے
اس میں ٹھہری ہوئی صدیوں کی طراوت لیں گے
اس کا دل بھیگ رہا ہوگا
نگاہوں میں تشکر کا اُجالا ہوگا
اپنے آقاؐ سے اُسی ربط کے اک لمحے میں
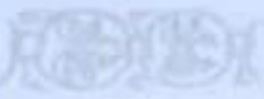
اس نے کیا کیا نہیں دیکھا ہوگا
اس نے کیا کیا نہیں چاہا ہوگا
میرے آقا کو خبر تو ہوگی!

سُبک ہوتی ہوا سے تیز چلنا چاہتی ہوں
میں اک جلتے دیے کے ساتھ جلنا چاہتی ہوں

غبارِ بے یقینی نے مجھے روکا ہوا ہے
زمیں سے پھُوٹ کر باہر نکلنا چاہتی ہوں

میں خود سہمی ہوئی ہوں آئنے کے ٹوٹنے سے
بہت آہستہ سطحِ دل پہ چلنا چاہتی ہوں

نمودِ صبح سے پہلے کا لمحہ دیکھنے کو
اندھیری رات کے پیکر میں ڈھلنا چاہتی ہوں

میں شہرِ شب کو آنکھوں کی دُعا دینے سے پہلے
در و دیوار کا چہرہ بدلنا چاہتی ہوں

کسی کے خواب کی تکمیل میں پتھر ہوئی تھی
اب اپنے خواب کی لَو سے پگھلنا چاہتی ہوں

تعلق کے بہاؤ کا مقدم استعارہ کس جگہ ہے
مرے گہرے سمندر تیری وحشت کا کنارا کس جگہ ہے

بتا اے روز و شب کی بے ثباتی میں توازن رکھنے والے
جسے کل ٹوٹنا ہے آج وہ روشن ستارہ کس جگہ ہے

بتا سر سبز کھیتوں سے گزرنے والے بے آواز دریا
اچانک پیچ کھا کر رُخ بدلنے کا اشارہ کس جگہ ہے

بشارت جس کے ہونے کی مجھے پہلے قدم پر دی گئی تھی
وہ گہرے اَبر کا سایہ مسافت کا سہارا کس جگہ ہے

سفر کرنا ہے اور اندھا مسافر سوچتا ہے کس سے پوچھے
سرِ ہستی اندھیرے راستوں کا گوشوارہ کس جگہ ہے

نہ سطحِ آب پر ہے اور نہ تہہ میں اُس کے ہیں آثار کوئی
بتا اے بحرِ غم! کاغذ کی کشتی کو اُتارا کس جگہ ہے
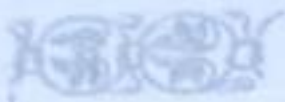
رہِ بے سائباں سے کوئی رشتہ جوڑ کر دیکھوں
میں اپنے شہر کی ساری فصیلیں توڑ کر دیکھوں

ہَوا کے رُخ پہ اُڑتے اَبر کو روکوں بھلا کیسے
جو رستہ خشک ہے تو آبلہ ہی پھوڑ کر دیکھوں

تعین تو کروں کس سمت میں مجھ کو بھٹکنا ہے
کسی کے ساتھ ہو لوں یا کسی کو چھوڑ کر دیکھوں

تمہارا عکس میری آنکھ پر کیوں کھل نہیں پاتا
اِس آئینے کے اندر کیا ہے اس کو توڑ کر دیکھوں

مجھے لگتا تو ہے میں بھی کسی رستے کی منزل ہوں
ذرا اک زندگی کے زاویے کو موڑ کر دیکھوں

اک دریچہ ہے کہیں ایسا جو وا ہوتا نہیں
ذہن و دل کی کشمکش سے ماورا ہوتا نہیں

یہ بھی ہوتا ہے کہ یونہی دیکھتی رہتی ہے آنکھ
رُوح و دل کا کوئی دروازہ کھلا ہوتا نہیں

تم مری بینائی کو محدُود کر دیتے ہو یوں
عکس کوئی آنکھ میں پھر دُوسرا ہوتا نہیں

زعم ہوتا ہے جسے اکثر یقیں کہتے ہیں ہم
کون کب چہرہ بدل لے کچھ پتا ہوتا نہیں

ایسے دُکھ کا بیج کس نے میرے اندر بو دیا
جو فقط صورت بدلتا ہے فنا ہوتا نہیں

رسائی راستوں کی ہے مقرر منزلوں تک
سمندر ہو گیا محدود اپنے ساحلوں تک

مسافر بھی تلاشِ رہگزر سے تھک گئے ہیں
دیوں کی روشنی بھی رہ گئی ہے محفلوں تک

تمہاری سوچ کے بھی زاویے پابند ٹھہرے
تمہاری خواہشوں کے رُخ بدلتے سلسلوں تک

فصیلِ شہرِ دل کے دَر کھلے ہیں اُن کی خاطر
خبر پہنچائی جائے جانے والے قافلوں تک

دیارِ زندگی کے سرد خانے سے گزر کر
کبھی بجھتی ہوئی اک آنچ سی پہنچی دلوں تک

سزا بے سائبانی کی یہی بتلا رہی ہے
کہ راہِ عدل پہنچی ہی نہ ہو گی فیصلوں تک

رُوح و دل میں شرار پیدا ہو
برف پگھلے، پگھل کے دریا ہو

ایک دولت جسے نہ بانٹیں ہم
درد ہو اور صرف اپنا ہو

دُھوپ اپنے وجود سے پھیلے
چھاؤں دینے کو اپنا سایا ہو

دُشمنی ہو تو ذات سے اپنی
اپنی ہی ذات پر بھروسا ہو

اُس کی آنکھوں میں رات اُترے جب
صرف میرا چراغ جلتا ہو

کوئی گوہر شناس ہو ایسا
گہرے پانی سے جو نہ ڈرتا ہو

گھر کے آنگن میں ایک دروازہ
صرف باہر کی سمت کھلتا ہو

وہ بھی میری تلاش میں نکلے
اور میری طرح اکیلا ہو
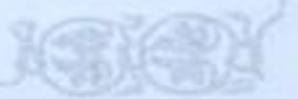
عطائے اَبر سے انکار کرنا چاہیے تھا
میں صحرا تھی مجھے اقرار کرنا چاہیے تھا

لہو کی آنچ دینی چاہیے تھی فیصلے کو
اسے پھر نقش بر دیوار کرنا چاہیے تھا

اگر لفظ و بیاں ساکت کھڑے تھے دُوسری سمت
ہمیں کو رنج کا اظہار کرنا چاہیے تھا

اگر اتنی مقدم تھی ضرورت روشنی کی
تو پھر سائے سے اپنے پیار کرنا چاہیے تھا

سمندر ہو تو اس میں ڈُوب جانا بھی روا ہے
مگر دریاؤں کو تو پار کرنا چاہیے تھا

دلِ خوش فہم کو صبحِ سفر کی روشنی میں
شبِ غم کے لئے تیار کرنا چاہیے تھا

شکستِ زندگی کا عکس بن کر رہ گیا ہے
وہی لمحہ جسے شہکار کرنا چاہیے تھا

خزاں کے دن ہیں شاخ پر گلاب ہے
زمینِ سنگ مبتلائے خواب ہے

حروفِ داستاں پہ خوش گماں سی
ورق سمیٹتی ہوئی کتاب ہے

جھلس نہ جائیں برگ و بار دیکھنا
جھکا ہوا زمیں پہ آفتاب ہے

دو نیم راستہ ہے میرے عہد کا
اِدھر ہے دشت اُس طرف سراب ہے

بدل رہا ہے روشنی کا زاویہ
نگاہ میری آج زیرِ آب ہے

سوال پر سوال پوچھتی ہوں میں
یہ مجھ میں کون اتنا بے حجاب ہے

میں وار کر رہی ہوں اپنے آپ پر
کسی کی بے حسی کا یہ جواب ہے

اُسی پہ بوجھ اُٹھائے چل رہی ہوں میں
جو راستہ کسی کا انتخاب ہے

یہ مان لیں کہ زندگی ہے اور کچھ
یہ جان لیں کہ خواب صرف خواب ہے

شجر پتوں کو اپنے ڈھونڈتا ہے
گئے موسم کی بابت پوچھتا ہے

قفس میں کھو گیا تھا جو پرندہ
اسے ہر ایک موسم سوچتا ہے

پسِ دیوار بھی رستہ ہے کوئی
یہ بس دیوار کا دَر جانتا ہے

مرے جذبِ دروں کی لَو سے کوئی
فقط اک صبحِ روشن مانگتا ہے

اُسے کیا جنگلوں سے، پربتوں سے
مرے اندر جو پنچھی بولتا ہے

بڑی اُونچی ہیں دیواریں چمن کی
کوئی باہر سے پھر بھی جھانکتا ہے

تعلّق

یہ کیسا ڈر ہے
جو منسوب ہے تم سے
یہ کیسے سائے ہیں
بہروپ کے سائے
جو میرے گرد ہر لحظہ
کسی وحشت کی بے آواز لَے پر رقص کرتے ہیں
یہ کیسا زہر ہے
بے ذائقہ، بے رنگ
جو میرے لہو میں جذب ہو کر
دھیرے دھیرے
اُس کے تازہ رنگ کو گدلا رہا ہے
آنکھ سے اوجھل
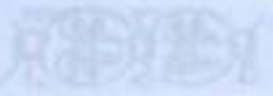
دیارِ ذات میں
دیوارسی اُٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
مری ہستی کے زنداں سے
نکلنے والے رستے بند ہوتے جارہے ہیں
اور تمہاری مطمئن آنکھیں
درِ زنداں پہ کندہ
میرے بے آواز اندیشوں پہ
پہرا دے رہی ہیں!
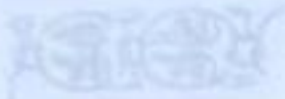
سفر کا دُوسرا رُخ

دن کی بے ترتیب تھکن میں
رات کی سونی ٹھنڈک میں
سرد چٹانوں کے رستے پر
سبزرو پہلے منظر میں
گرداٹی دیواروں والی
دُھلے دریچوں کی رُت میں
آنکھ کے نم کی بے چینی میں
خفی تبسم کے پَل میں
میری آنکھ نے جو کچھ دیکھا
وہ اُس نے کب دیکھا ہے
میرا سایہ
میری سوچ کا بوجھ اُٹھائے

چلتے چلتے اوب گیا ہے
میں بھی تنہا
وہ بھی تنہا
دونوں رات کا پہلا لمحہ ڈھونڈ رہے ہیں
گردش گردش
وقت کا رستہ ناپ رہے ہیں
لمحوں کے اُڑتے ذرّوں سے
رنگِ ندامت ڈھانپ رہے ہیں!

بسرتی یادوں کے سب دریچوں کو کھولتا ہے
یہ لمحہ کتنے اُداس لہجے میں بولتا ہے

میں خود بھی حیراں ہوں نرم لہجے کا حرفِ شیریں
سماعتِ دل میں کس طرح زہر گھولتا ہے

جواز دوں بھی تو کیسے دوں اپنی برہمی کا
کہ میرا غم تو اُسی کے لہجے میں بولتا ہے

میں جب سے پہنچی ہوں خودشناسی کے دائرے میں
گرہ گرہ کوئی سارے اسرار کھولتا ہے

فگار ہے کیوں وہ آج موسم کی بے رُخی سے
جو ہاتھ میزانِ دل پہ کانٹوں کو تولتا ہے

نگاہِ ساحل کا ذرّہ ذرّہ گواہ ٹھہرا
کہ چڑھتا سورج بھی قلبِ دریا میں ڈولتا ہے

جو مٹتا جا رہا ہے پھر وہی منظر بنانا ہے
مجھے احساس کی دیوار میں اک در بنانا ہے

مجھے پہچان دینی ہے کسی موہوم رشتے کو
مجھے بے جسم و جاں تصویر پر اک سر بنانا ہے

مجھے زنجیر کرنا ہے کہیں بے سمتیٔ دل کو
ہوا کی موج پر ٹھہرا ہوا اک گھر بنانا ہے

مجھے تو عکس اپنا ڈھونڈنا ہے پتھروں میں بھی
طلسمِ آب و آتش سے انہیں گوہر بنانا ہے

کنارِ دشت اک کشتی ہے اور پتوار ہاتھوں میں
سوابِ دریا مجھے اس دشت کے اندر بنانا ہے

مجھے آگہی کا نشاں سمجھ کے مٹاؤ مت
یہ چراغ جلنے لگا ہے اس کو بجھاؤ مت

مجھے جاگنا ہے تمام عمر اِسی طرح
مجھے صبح و شام کے سلسلے سے ملاؤ مت

مجھے علم ہے مرے خال و خد میں کمی ہے کیا
مجھے آئنے کا طلسم کوئی دکھاؤ مت

مجھے دیکھ لینے دو صبحِ فردا کی روشنی
مری آنکھ سے ابھی ہاتھ اپنا ہٹاؤ مت

وہی پیڑ ہے وہی شاخ ہے وہی نام ہے
جو گرا ہے پھول یہاں سے اس کو اُٹھاؤ مت

مجھے تہہ میں جا کے اُچھالتے ہیں گہر کئی
میں ہوں مطمئن، مجھے ڈوبنے سے بچاؤ مت

تمہیں بے مقام رفاقتوں کی تلاش ہے
مرا شہر، شہرِ ثبات ہے، یہاں آؤ مت

میں زندہ رہتی ہوں اور زمانوں میں
دیے کی صورت جلتی ہوں تہہ خانوں میں

نرم ہَوا کی دستک تو اب خواب ہوئی
اُس کی آہٹ سُنتی ہوں طوفانوں میں

کہیں کہیں اک پردہ سا رہ جاتا ہے
سب کردار نہیں کھلتے افسانوں میں

کھلے دریچے دیکھے تو ڈر جاتا ہے
اک مہمان انوکھا ہے مہمانوں میں

کیا جنگل بھی اپنی رنگت بدلے گا
پنچھی لوٹ کے آئے ہیں کاشانوں میں

ترا عکسِ ندامت چاہتا ہے
دلِ آئینہ حیرت چاہتا ہے

ہَوا سے ہے مسلسل گفتگو میں
دیا جلنے کی مہلت چاہتا ہے

برسنے دو وہیں پر بادلوں کو
سمندر اور وسعت چاہتا ہے

مرے احساس کو اک بوجھ دے کر
ترا احسان قیمت چاہتا ہے

اندھیری رات سے ماہِ تمنا
چمکنے کی اجازت چاہتا ہے

مرے اندر کوئی مجھ سے سوا بھی
ترے غم کی حفاظت چاہتا ہے

صلیب بردوش

میں اپنے جسم کو
اپنے ہی کاندھوں پر اُٹھائے
تھک گئی ہوں
چلتے چلتے تھک گئی ہوں
ایسے لگتا ہے کہ سُورج کی فراواں روشنی
اپنے معانی کھو رہی ہے
اور سارے رنگ
بے موسم اُترتی بارشوں میں دُھل رہے ہیں
پھر بھی چلتی جا رہی ہوں
چلتے رہنا ہے مجھے یونہی

کہیں رستے میں

دریا کی روانی دل میں اُترے گی
کہیں پر ریت آنکھوں میں چبھے گی
اور کہیں پتھر مری رفتار سے اُلجھیں گے
سبزہ زار بھی آئیں گے
پھر سُوکھے درختوں کی قطاریں
اور پھر اک شہر
پھر ویران رستہ
پھر کوئی جنگل، ہرا جنگل
پھر اس کے بعد کوئی اور رستہ
اَن گنت رستے
پھر ان سب راستوں کے بعد
دیوارِ ابد ٹوٹے گی
اَن دیکھے سفر کے واسطے
پھر راستے ہی راستے
جن کی اذیت اور راحت
دھیان کی گردش سے باہر ہے
مگر میں تو ابھی سے تھک گئی ہوں!

جو ساحل کے ہر اک ذرّے پہ لکھا تھا

جو ساحل کے ہر اک ذرّے پہ لکھا تھا
وہ ہونا تھا
کہاں تک موجِ دریا آئی
اور سب کچھ بہا کر لے گئی ہے

تھا بھی کچھ
یا کچھ نہیں تھا---؟
کچھ تو ہوگا
ڈوبتی تحریر میں کچھ رنگ باقی رہ گئے ہیں

کوری مٹی کے ورق پر
پھر کوئی تازہ عبارت لکھی جائے گی
زمیں کے چہرۂ بے نور پر بہتی سیاہی

پھر سے روشن ہو تو جائے گی
مگر لہروں کی آنکھوں میں
ہوس بڑھنے لگی ہے
دامنِ دریا بھی گہرا ہو رہا ہے
کوہساروں سے اُترتی برف بھی کچھ کہہ رہی ہے
دھیرے دھیرے
منجمد ساحل کی جانب
بہہ رہی ہے!

دُکھ

نہ جانے کس زباں کے لفظ لکھتی ہوں
جنہیں تم پڑھ نہیں سکتے
مری آواز ہی مدھم ہے
جس کو سُن نہیں سکتے
مرے لہجے کے زیر و بم سے بھی
نا آشنا ٹھہرے
تمہاری آنکھ سے اوجھل ہیں وہ لمحے
جنہیں میں
دُکھ کے گہرے زرد و نیلم رنگ سے
تصویر کرتی ہوں
بکھرتی بات کو زنجیر کرتی ہوں،
مری تصویر کے رنگوں کی وحشت سے

تمہاری آنکھ تک جو فاصلہ ہے
اس میں پھیلی نارسائی
جو ہمارے درمیاں دیوار کی صورت کھڑی ہے
میرے دل پر
جسم و جاں پر
زندگی پر
مہر ہوتی جا رہی ہے،
فاصلے کا
مضمحل احساس کی سرحد پہ پہرا ہو گیا ہے
زرد و نیلم رنگ دیکھو کتنا گہرا ہو گیا ہے!

دس لکیریں

مرے ماتھے پہ شاید دس لکیریں ہیں
جو پہلی تین ہیں
وہ تین پھولوں کی ہری شاخیں ہیں
چوتھی اک تناور پیڑ کی جڑ ہے
بدلتے سائے کی اُلجھن سمیٹے
پانچویں، دن رات سرپٹ دوڑتے
کم فہم رستے کی تھکن ہے
اور چھٹی مانوس ہاتھوں سے لکھی
بے انت کڑوی داستاں ہے
ساتویں، دُنیا کے دھندوں کی
کھلی سفّاکیوں کی اک جُھری ہے
آٹھویں اور پھر نویں

دونوں لکیریں
میری اپنی ذات کی مٹی میں پھیلی
نارسائی کی لکیریں ہیں
تلاشِ رائیگاں میں
گوشہ گوشہ
چپّہ چپّہ چھانتی پاگل لکیریں
آخری، دسویں لکیر
عمر کے صحرا میں اک دریا کا رستہ ہے
وہ دریا جس کو بہنا تھا
وہ دریا جس کو شاید اب بھی بہنا ہے!

حرف کھرے چنتی ہوں سارے اور سچائی لکھتی ہوں
ڈھلتے سُورج میں چڑھتی ہوں اور چڑھتے میں ڈھلتی ہوں

وقت کی سرگوشی نے مجھ کو جتنے بھید بتائے ہیں
دل کے تہہ خانے میں سب سے آنکھ بچا کر رکھتی ہوں

قریہ قریہ گوشہ گوشہ یونہی بیج لگاتے ہو
میں بستی سے دُور گھنے گھرے جنگل میں کِھلتی ہوں

اپنی جانب کھینچ رہا ہے یوں گہرائی کا دامن
ساحل پر ہے مرا ٹھکانہ اور دریا میں بہتی ہوں

کون ہے جو تاریکی میں بھی مجھ کو تکتا رہتا ہے
میں اس کو پہچان نہ جاؤں جس سائے سے ڈرتی ہوں

مجھ کو اپنی ذات میں اِک دیوار اُٹھانی پڑتی ہے
اک حصے میں رہتی ہوں اور اک حصے میں مِلتی ہوں

میرے آنگن پھُول ہیں جو بس وہ میرا سرمایہ ہیں
اُن کی خاطر موسمِ جاں کی تیز ہَوا سے لڑتی ہوں

میں ساون کی کوئی پہلی جھڑی تھی
بہت ہی خشک مٹی پر پڑی تھی

چٹانیں ہی چٹانیں جس جگہ پر
وہاں میں مدتوں سے کیوں کھڑی تھی

بہت سنسان پگڈنڈی تھی دل میں
جو مجھ سے عُمر میں برسوں بڑی تھی

بکھر کر جمع ہونے میں نہ آئی
کسی کی بات موتی کی لڑی تھی

نہ جانے کیوں مجھے ڈر لگ رہا تھا
تمہارے ہاتھ میں تو پھلجھڑی تھی

جہاں تم نیند میں کچھ کہہ رہے تھے
وہ میرے جاگ اُٹھنے کی گھڑی تھی

دوبارہ جس نے مجھ کو زندگی دی
وہ ساعت زندگی سے بھی کڑی تھی

اُڑا کے لے گئی اس کے سبھی سراغ ہَوا
بنی ہوئی ہے مجسم مرا چراغ ہَوا

گلوں کو خاک بنا کر بکھیرتی ہے کہاں
نہ سوچتی نہ سمجھتی ہے بے دماغ ہَوا

نگر نگر کا پتہ جانتے ہوئے بھی کبھی
دکھا سکی نہ کسی کو کسی کے داغ ہَوا

کسی کے شہر سے آئی تھی اور چلی بھی گئی
رُکی نہ صحنِ تحیّر میں کم فراغ ہَوا

ذرا سی دیر کو خوش ہوں تو مشتعل ہے بہت
اُداس کر کے مجھے ہو گی باغ باغ ہَوا

اُس کے ہاتھوں نے جلایا تو رہے گا یہ دیا
اپنی حدّت کو ہواؤں پہ لکھے گا یہ دیا

یہ بھی لگتا ہے کہ ایسے نہ بجھے گا یہ دیا
ہو نہ ہو آگ لگا کر ہی رہے گا یہ دیا

وقت کی ساری حدیں اپنی تمازت میں لئے
شہرِ احساس میں دن رات جلے گا یہ دیا

گھر میں ہو، بام پہ ہو یا ہو سرِ راہگزر
قحطِ بینائی کی تعزیر سہے گا یہ دیا

بات اپنی جو ہواؤں کے حوالے کر دی
وہ کسی اور دیے سے نہ کہے گا یہ دیا

میں کیسا آئنہ تکنے لگی ہوں
جو اپنے آپ سے ڈرنے لگی ہوں

مجھے ویران قریوں کی طلب ہے
کسی آسیب میں بسنے لگی ہوں

میں بے موسم شجر ہوں زندگی کا
خزاں کی گود میں پھلنے لگی ہوں

بوقتِ شام ہوں جو ساتھ اُس کے
میں سائے کی طرح بڑھنے لگی ہوں

مبرا ہو گئی ہوں چارہ گر سے
میں خود ہی زخم کو بھرنے لگی ہوں
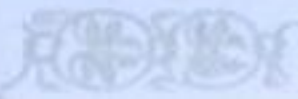
مرے احساس کی سمتیں ہیں مبہم
کہ جیسے نیند میں چلنے لگی ہوں

اچانک ہی اندھیرا ہو نہ جائے
سو دن کے طاق میں جلنے لگی ہوں

سہارا دے رہی ہوں دھوپ کو میں
خزاں کا اَبر ہوں، چَھٹنے لگی ہوں

جو میں سوچتی ہوں

جو میں سوچتی ہوں
وہ سچ نہ ہو
کہیں سچ نہ ہو
یہ عذاب پھر سے
لہو کے سرد بہاؤ میں
کہیں مل کے اس کو بدل نہ دے
یہ جو رنگ اُڑنے لگا ہے عکسِ خیال سے
کہیں یوں نہ ہو
کوئی ہاتھ اسکو اُجال دے
یہ جو پھُول سوکھا ہوا ہے طشتِ سوال میں
کوئی تازہ جھونکا ہَوا کا
اس کو نئی رُتوں کا جمال دے

کہیں یوں نہ ہو
یہ جو صبح و شام کے رنگ میں ہے الاؤ سا
یہ جو کاہشِ دل و جاں میں
اسمِ جمیل کا ہے رچاؤ سا
کہیں سچ نہ ہو
جو میں سوچتی ہوں
وہ سچ نہ ہو
کہیں سچ نہ ہو

تمھارے پھُول تازہ ہیں

تمھارے پھُول تازہ ہیں
مری سب انگلیوں پر اُگ رہے ہیں
اور یہ شاخیں
یہ میری انگلیاں،
کیسی ہری ہیں
ان کی شریانوں میں بہتا رنگ
پھُولوں کے لبوں سے بہہ رہا ہے
قطرہ قطرہ
ایک بے موسم کہانی کہہ رہا ہے!

تکمیل

بلا کی بھیڑ میں
میں نے جو تم سے بات کی
بے لفظ تھی
لیکن مجھے معلوم ہے
تم سُن رہے تھے

میں اور تم

تم فصیلِ آہن ہو
میں کہ ٹوٹ سکتی ہوں
دائرے میں شدّت سے
گھوم کے جو ٹکراؤں
پاش پاش ہو جاؤں
اور فصیلِ آہن پر
ایک نقش بن جاؤں

دُکھوں کی اپنی اک تفسیر ہوتی ہے

اندھیرے سے
کشیدِ صبح کی
روشن گواہی مانگنے سے
رات کے لمحے
نہ گھٹتے ہیں
نہ بڑھتے ہیں

کبھی گہرے بھنور کے بیچ اُٹھتی
دُوریوں کی دُھند میں لپٹی
کسی کی ساحلی آواز
دریا کا کنارا ابھی نہیں ہوتی

دُکھوں کی اپنی اِک تفسیر ہوتی ہے

جو اپنے لفظ خود ایجاد کرتی ہے
جو خوابوں سے اُلجھتی ہے
جو خوابوں سے زیادہ
معتبر ہوتی ہے
لیکن کشف کا لمحہ
مسافت کی ہزاروں منزلوں کے بعد آتا ہے

نمودِ گوہرِ کمیاب کی ساعت میں
خالی سیپیوں کا ڈھیر بے معنی نہیں ہوتا!

اُس لفظ کو محسوس کرنا

کسی بھرپور لمحے میں
کسی کمزور لمحے میں
کسی بے مہر لمحے میں
اگر وہ لفظ کوئی کہہ بھی دے
تو اس کو
لوحِ زندگی پر
نقش مت کرنا
مگر اُس لفظ کی آواز کو
محسوس کرنا
سوچنا
محفوظ کرنا
جو

کسی بھرپور لمحے میں
کسی کمزور لمحے میں
کسی بے مہر لمحے میں
ادا ہونے سے پہلے ٹوٹ جاتا ہے
صداؤں کے بھنور میں ڈوب جاتا ہے!

گریۂ ہجر کو رُکنے کا اشارا ہی نہ ہو
کیا خبر اپنے سمندر کا کنارا ہی نہ ہو

کیا خبر بھول گیا ہو کبھی محور اپنا
آج جو خاک ہوا ہے وہ ستارا ہی نہ ہو

کیا خبر آیا تو ہو موج کے ہمراہ کوئی
ساحلِ دل پہ اُسے ہم نے اُتارا ہی نہ ہو

تپشِ ضبط میں ہو آبِ رواں، کیا معلوم
دشتِ دل نے کبھی دریا کو پُکارا ہی نہ ہو

زعمِ تقدیر جسے جیت سمجھ بیٹھا ہے
کیا خبر کھیل یہ دُشمن مرا ہارا ہی نہ ہو

آج پھر لوحِ دلِ سرد پہ جو لکھا گیا
وہ پشیمان سا اک نام ہمارا ہی نہ ہو

یہ بھی ہوسکتا ہے جب گونج اُٹھیں نغمہ و نَے
کوئی آواز سماعت کو گوارا ہی نہ ہو
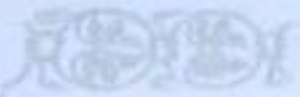
مسندِ تمکنت پہ اُس کا ظہور
خاک میں مل گیا ہے سارا غرور

آئنہ ٹوٹ کر بکھر جائے
عکس لیکن اسے کرے گا ضرور

کون سا اسم پڑھ لیا میں نے
پھیلتا جا رہا ہے نور ہی نور

میں زمیں پر ہوں یا ہوں زیرِ زمیں
آسماں ہو گیا ہے اور بھی دُور

در تو میں نے کبھی نہیں کھولا
کون زنداں میں ہو گیا محصور

میں اُلجھتی رہی اندھیرے سے
اور سارا تھا روشنی کا قصور

موت کا خوف مٹ گیا مجھ میں
کر لیا میں نے زندگی کو عبور

رُوح و جاں کی تشنگی نے یوں بھی دیکھا ہے سراب
برف پر تھے پاؤں میرے اور سر پر آفتاب

مجھ کو سائے کی، کسی کو دُھوپ کی خواہش رہی
ایک کی تسکین ٹھہری دُوسرے کا اضطراب

روشنی بھی، رنگ بھی ساتوں اکٹھے تھے مگر
کھل نہ پایا زندگی پر اک نئے رستے کا باب

درد کی دیوار پر لکھی کہانی ڈھل گئی
جسم کی مٹی کا حصہ ہو گئی تحریرِ آب

میں تو اپنے آپ سے مغلوب ہو کر رہ گئی
آپ ہی لیتی رہی ہوں اپنے لمحوں کا حساب

ڈھونڈتی تو ہوں مگر اب وہ ورق ملتا نہیں
پڑھتے پڑھتے بند کر دی تھی جہاں میں نے کتاب

دریچہ جیسے کوئی کھل گیا ہے
کوئی مجھ میں ہی مجھ کو دیکھتا ہے

سزائے موسمِ بے اعتباری
کہ تم کو سوچنا بھی مرحلہ ہے

میں خود ہی اپنے ہونے کا سبب ہوں
نہ تم ہو اور نہ کوئی دُوسرا ہے

کہیں لمحوں کہیں صدیوں کا حامل
میانِ روز و شب جو فاصلہ ہے

اُسی کے عکس کو کیسے سمیٹے
سمندر میں جو بہتا آئنہ ہے

میں طوفاں میں تحفظ ڈھونڈتی ہوں
تعاقب میں مرے موجِ صبا ہے
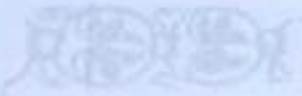
فصیلِ بے یقینی سے گزر کر
تمہارا آنا جانا معجزہ ہے

ہراساں بستیوں سے جنگلوں تک
ادھورے راستوں کا سلسلہ ہے

کالے گھُپ اندھیرے پر

کالے گھُپ اندھیرے پر
اندھی انگلی سے نظمیں لکھیں
مدھم، تیکھے
سوتے جاگتے
رنگ برنگے چہروں والی
کتنی نظمیں،
نیند آئی تو
نظموں کے پتّے ڈھل ڈھل کر خواب بنے
اور خوابوں کے انبار لگے،
اندیشہ جاگا
نظمیں رُوپ بدل کر گہری نیند سے اُٹھیں
رات کی بارش بھُول گئیں

جب دن نکلا تو
دھیان کا سُورج ڈُوب گیا
جب دن نکلا تو
موم کی تصویروں پر شب کی راکھ گری
جب دن نکلا تو
نظموں کے پتّے جھڑ جھڑ کر دُھول ہوئے

دُعا، بد عا ھے

تم جزا ہو
تو میری سزا کون ہے
تم سزا ہو تو پھر
یہ سزا
آسماں سے اُترتی ہوئی چاپ کی طرح
زینہ بہ زینہ
عبادت میں کیوں ڈھل گئی
کیسے
سجدہ بہ سجدہ
مقدس صحیفوں میں محفوظ ہوتی گئی،
کوئی کہتا ہے
ایسی عبادت کی خواہش سزا ہے
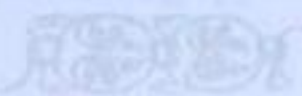
یہ سچ

گہری راتوں پہ کھُلتی ہوئی صبح کی طرح شفاف ہے

کہ یہ خواہش سزا ہے،

جزا ہی سزا ہے

دُعا، بد عا ہے
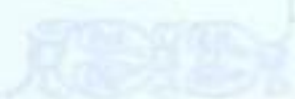
عین اُس وقت جب

عین اُس وقت جب
میری آواز پر
ایک آہٹ ہوئی
آسماں کی تہوں سے
ستاروں بھرے ہاتھ نے
میری آنکھوں کے دَر کھول کر
مجھ کو اِک روشنی کے قبیلے میں داخل کیا
مجھ کو ایسے لگا
تم وہیں تھے کہیں
میری آواز کو
اس کی گیرائی کو
اپنے دل میں سمیٹے ہوئے

تم نے افلاک کو اپنے ہاتھوں سے تھاما ہوا تھا
کوئی اسم شدت سے
مجھ میں سفر کر رہا تھا
کوئی باس تھی جو نئی تھی
کوئی رنگ تھا جو نیا تھا
مرا خون نوزائیدہ پتیوں سا ہرا تھا

وہی میہماں وہی رہگزر وہی وقت تھا
تو حقیقتوں کا بھی خواب سے کوئی ربط تھا!

وہی آج تک مری منزلوں کا رقیب ہے
وہ جو راستے میں گھنا سا ایک درخت تھا

وہ جو فیصلے کی گھڑی تھی، آئی، گزر گئی
کہ مقابلہ سرِ سیلِ جاں بڑا سخت تھا

مرے راستے کی رکاوٹیں بھی عجیب تھیں
ترے نقشِ پا کی تلاش تھی، مرا رخت تھا

مرے عکس پر وہی کشمکش کے نشان تھے
ترے آئنے کا ستم وجود پہ ثبت تھا

جو زباں پہ آئے تھے لفظ ان کی خطا ہی کیا
کہ رفاقتوں میں دلوں کا لہجہ کرخت تھا

اس قدر زور تھا طغیانی میں
آسماں ڈوب گیا پانی میں

ایک احساس چراغوں جیسا
بجھ گیا اس کی نگہبانی میں

غم کی تزئین نہیں ہو سکتی
ایک مشکل بھی ہے آسانی میں

اتنی بوجھل کہ جُھکی پڑتی ہے
شاخِ گُل موسمِ ارزانی میں

واقعہ کوئی بھی مربوط نہیں
اُس کے افسانۂ طولانی میں

عکس اُس کا ہے نمایاں کتنا
میری تصویرِ پشیمانی میں

نامۂ دل پہ کہیں حرفِ گریز
لکھ دیا میں نے پریشانی میں

گراں بد ذائقہ لمحے

گراں بد ذائقہ لمحے!
مجھے ڈر ہے
نہ ایسا لفظ لکھ دوں
جس کی بے مہری
ہمیں اُن دائروں کی سرزمیں پر چھوڑ آئے
جو بگولوں کی طرح بس گھومتے ہیں
گھومتے رہتے ہیں
اور پھر زندگی کی سرحدوں سے دُور
اَن دیکھے سفر پر جا نکلتے ہیں!
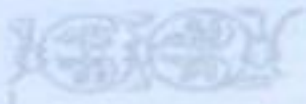
بدگمانی

سرد، نیلی دُھند اوڑھے
درد کا اک آشنا سایہ سا لہراتا ہے مجھ پر
پھر کوئی ہنستا ہے
اور ہنستا چلا جاتا ہے مجھ پر

کرب

میں کہیں آگے
بہت آگے
اُفق کے پار رقصاں روشنی کو دیکھتی ہوں
جن کا امکاں بھی نہیں شاید
میں ایسے حادثوں کو سوچتی ہوں
وقت کی رفتار سے بھی تیز ہیں جو ساعتیں
میں اُن کے پیچھے بھاگتی ہوں
منتظر ہوں آنے والے خواب کی میں
اور مسلسل جاگتی ہوں

مگر تم نے کبھی سوچا

تمہارے واسطے میں اک سزا ہوں
یوں، کہ میں
مٹی میں لکھے، اَن لکھے لفظوں کے معنی
جانتی ہوں
پتھروں کی کوکھ سے
اُگتے ہوئے سبزے پہ میں
حیراں نہیں ہوں
اور تمہارے کرب کے
آئینۂ سادہ میں
اپنا زرد سایہ دیکھ سکتی ہوں---

مگر تم نے کبھی سوچا
کہ جنگل کیوں ہرا ہوتا ہے
اور کیوں زرد ہوتا ہے؟

کبھی شک کی فصیلوں میں

وہ دل جو آنکھ کے تابع ہو
منظر کے اُدھورے ذائقے کو جذب کرتا ہے
کہ پس منظر کے خال وخد نہیں ہوتے

کبھی شک کی فصیلوں میں
دریچے بھی نہیں کھُلتے
فصیلوں کے اُدھر
رنگوں کا،
خوشبوؤں کا موسم
بیت جاتا ہے
وہ دل جو آنکھ کے تابع ہو
دیواروں میں رستہ بھُول جاتا ہے!

مگر یہ گرد

یہ میرے، گرد
آوازوں میں آنکھیں
اور آنکھوں میں
اُدھورے لفظ، لہجے بولتے ہیں
کچھ سُنائی بھی نہیں دیتا
دکھائی بھی نہیں دیتا
یہ سب مجھ سے مخاطب ہیں
کہ میں ان سے مخاطب ہوں
کثیلی گرد بیٹھے تو سجھائی دے
مگر یہ گرد؟
یہ تو میرے ہی پیروں سے اُڑ کر
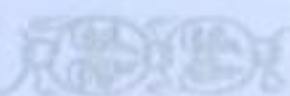
پھیلتی جاتی ہے
اور اندھی ہوا کے آئینے پہ
جمتی جاتی ہے

یہ شہرِ دل نہیں

یہاں لہجے میں غم خواری نہیں ہوتی
بہت خوش رنگ لیکن بے ثمر موسم
ادھورا ذائقہ
ہر لفظ بے تاثیر
بے آواز لب
بے چشم ہر تصویر
دریائے نمو کی ایک ہی منزل،
کناروں سے پرے ہوتا ہوا
گاڑھا سمندر،
بے کراں احساس کی
قیمت یہی ہوتی ہے

اور حصوں میں بٹتی ہے،
یہاں رسمِ وفاداری نہیں ہوتی
یہ شہرِ دل نہیں
شہرِ مراسم ہے

اپنے ابّو کے لیے ایک نظم

تمہاری زندگی کے سرد لمحے نے
تمہارے جسم کو
جب خاک کی تہہ میں اُتارا تھا
تو میرے ڈُوبتے دل پر
ذرا سی دیر کو
گہرے سکوں کی لہر کا غلبہ ہوا تھا
مجھ سے اب کوئی تمہیں پوچھے گا
تو بتلا سکوں گی
تم کہاں ہو

پھر میں سب کی

کھوجتی، حیران آنکھوں سے
کہیں چُھپ کر
بہت ہی دیر تک
اس دھیان میں روئی
کہ تم اب تک کہاں تھے!

میرے فن کی نمود ہے جس سے
مجھ کو اُس کرب نے سنبھالا ہے

میں تو زندہ وہاں پہ بھی رہتی
مجھ کو ملبے سے کیوں نکالا ہے
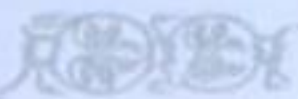
ایک اِک حرف سمیٹو مجھے تحریر کرو
مری یکسوئی کو آمادۂ زنجیر کرو

سب خدوخال مرے دُھندہوئے جاتے ہیں
صبح کے رنگ سے آؤ مجھے تصویر کرو

جیتنا میرے لیے کرب ہوا جاتا ہے
مرے پندار کو توڑو مجھے تسخیر کرو

اُس عمارت کو گرا دو جو نظر آتی ہے
مرے اندر جو کھنڈر ہے اُسے تعمیر کرو

یا مری آنکھ سے لے لو خلشِ بینائی
یا مرے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرو

دیے سے تو دیا جلتا رہے گا
مگر پہلا دیا کیسے جلے گا

یہ ہم پر سانحہ ہو کر رہے گا
دُھواں جلتے دیے سے بھی اُٹھے گا

سمندر ملگجی سی روشنی کا
مگر قفلِ نظر کیسے کھلے گا

بہت شوقِ رفو تم کو ہے لیکن
کہیں پر زخم ہو گا تو سلے گا

مرے احساس کی منظر کشی میں
تمہیں ہر گام پر دریا ملے گا

اُسے پہچاننا مشکل نہیں ہے
دوبارہ دیکھنے پر ہی کھلے گا

پناہِ خواب میں سویا ہوا دل
کہاں تک زندگی سے چھپ سکے گا

موجۂ دل! تجھے روکوں کیسے
اصل تصویر کو دیکھوں کیسے

کس طرح سائے کی تردید کروں
پسِ دیوار ہی ٹھہروں کیسے

کیسے ناپید کہانی پڑھ لوں
اَن کہے لفظ کو پرکھوں کیسے

جو ہے موجود اُسے پاؤں کیا
جو نہیں ہے اُسے مانگوں کیسے

حرفِ تقدیر بدل تو ڈالوں
ترا لکھا ہوا سمجھوں کیسے

کیسے تفسیر بتاؤں اپنی
سانحہ اپنا ہی لکھوں کیسے

جس کے حلقے میں نہیں رُوح میری
ایسی زنجیر کو توڑوں کیسے

نیند تو ٹوٹ چکی ہے میری
خواب کے سحر سے جاگوں کیسے

سمندر سامنے ہے

سمندر سامنے ہے
اور ہمارے درمیاں
بس ڈُوبنے کا فاصلہ ہے
زندگی کا بوجھ
اس کے وزن سے بھاری ہے
پانی کا تو کیا ہے
تیرنے والے کو بھی ڈستا ہے
اس کو بھی نگل لیتا ہے
میں تو
بے حقیقت
اس ہنر سے بے خبر
ناآشنا، خائف،

مجھے تو سیپیاں چُننے کی خواہش ہے
کہ میں بطنِ صدف سے
اک اچانک ملنے والی سرخوشی کی
منتظر ہوں

کیا کروں
اِن موتیوں سے
مجھ کو اک گہرے خلا کا
زخم بھرنا ہے
اُدھر بپھرے سمندر کا تلاطم
اس کو اپنا کام کرنا ہے!

مجھے خواہش ہے

مجھے خواہش ہے
تصویریں بناؤں
لفظ جو کچھ کہہ نہیں سکتے
انہیں رنگوں کے دریا میں بہاؤں
ہنستے رنگوں میں کہیں
گہری سیہ
گدلی خموشی کو ملاؤں
ڈوبتے احساس کا ایسا خفی لمحہ
جو لفظوں سے گریزاں
قطرہ قطرہ بہتا جاتا ہے
کہیں اس وقت سے پہلے
کہ جلتی ریت میں تحلیل ہو جائے

کسی بادل کسی ندی میں کھو جائے
اسے رنگوں کے دامن میں سموڈالوں
وہ ہلکی سی خفی جنبش
جولفظوں کی ادھوری دسترس میں
آ نہیں سکتی
وہ نقشِ موقلم میں ثبت ہو جائے
بکھرتے فاصلوں کا ربط ہو جائے!

خشک زمیں پر پھول اُگا یا
کس نے نیا لہجہ اپنایا

سبز نشانی دینے والا
بہتا دریا ہاتھ نہ آیا

بام پہ تاریکی منڈلائی
تہہ خانے میں دیا جلایا

آنکھ کی حیرانی کہتی ہے
وہی ہے اپنا وہی پرایا

مرے ہی سر پر دُھوپ تنی ہے
مرے ہی سر پر اَبر کا سایا

وہ ساعت بھی آ پہنچی جب
بے چینی سے جی بہلایا

لَوٹ کے آنا مشکل ہو گا
جانے والے کو سمجھایا

بول کہانی لکھنے والے
جھوٹا قصہ کیوں دُہرایا

تیری میری سرد انا کا
کتنا کم قیمت سرمایا

بند کھلا ہے کیسے کیسے رازوں کا
بدل رہا ہے چہرہ سب اندازوں کا

رات گئے آسیب زدہ سناٹے میں
دھیان آتا ہے مجھے کھلے دروازوں کا

چہرے تو سب ایک ہی جیسے لگتے ہیں
کھوج لگانا ہے مجھ کو آوازوں کا

اپنی سوچ کی لَے پر جب بھی سُنتی ہوں
سُر کومل ہو جاتا ہے سب سازوں کا

سرد فضا میں سارے موسم ڈوب گئے
طائر رستہ بھول گئے پروازوں کا

دشتِ شب سے نکل گیا ہو گا
چاند ہی تھا سو ڈھل گیا ہو گا

اُس کی پہچان سے گلہ کیسا
میرا چہرہ بدل گیا ہو گا

منزلیں جو نہیں ملیں اُن کو
بند رستہ نگل گیا ہو گا

بارشیں سوچ تو رہی ہوں گی
دُھوپ میں باغ جل گیا ہو گا

آسماں زعمِ استقامت میں
گرتے گرتے سنبھل گیا ہو گا

باادب! اس طرف کوئی آہٹ نہ ہو

خوف کی دُھوپ میں
خوف کی چاندنی،
خوف کی چھاؤں میں
خوف کے دائرے کے تحفظ میں
ہنستی ہوئی
کھیلتی، کھلکھلاتی ہوئی
ایک ننھی سی بچی
بڑی ہوگئی---
آنکھ میں خوف کی مشعلیں
جسم پر خوف کی تازگی
خوف کے پیرہن میں سجی

خوف کا سر پہ جھومر لگائے ہوئے
خوف کی وادیوں میں کِھلی
خوف کی خوشبوؤں میں بسی
خوف کے آسمانوں کی
وسعت میں گم ہوگئی
خوف در خوف چھنتی ہوئی تمکنت
خوف در خوف لپٹی ہوئی راحتیں
خوف کا سائباں
ایک اک لفظ پر
خوف کی انگلیاں
خوف کے بھیس میں
سرخ چہرے پہ لکھی ہوئی مَنّتیں
اک نئے باب میں
خواب میں
خوف کا ہر سبق
خوف کی ہر سند

خوف کی رسیوں پہ تنی ساعتیں
ساعتوں میں چھپی
خوف کی جُھریاں
خوف کا دائرہ
دائرے میں چُھپا
اوراک دائرہ---

باادب!
اِس طرف کوئی آہٹ نہ ہو
شاہزادی یہاں
خوف کی خاک اوڑھے ہوئے
سو رہی ہے!

مری ہنسی کے تلاطم میں

مری ہنسی کے تلاطم میں ایک آنسو تھا
جو تم نے دیکھا نہیں
جو میرے جسم میں اب جذب ہو گیا ہے کہیں
چٹان ہوں میں
سمندر مجھے بہائے کہاں
یہ قرن قرن پٹختا رہے گا سر اپنا
تو ریزہ ریزہ مری شکل کو بدل دے گا
مرے وجود پر رنگِ سیاہ مَل دے گا
یہ رنگ آنکھ کی پُتلی کا رنگ بھی تو ہے
یہ رنگ درد کے چہرے کا رنگ بھی تو ہے
یہ رنگ دُور تلک دائرے بنائے گا
کبھی یہ رنگ تمہیں بھی نظر تو آئے گا

زندگی قرنوں پہ لکھا جُھوٹ ہے

زندگی قرنوں پہ لکھا جُھوٹ ہے
اک بے ارادہ معرکہ ہے---

بین کرتے دُکھ ہمارے
اور صبحوں کی نمود،
نیند لیتے دُکھ ہمارے
اور راتوں کا قیام،
رقص کرتے دُکھ ہمارے
اور خلاؤں کا سکوت،
ریت جیسے دُکھ ہمارے
ذرہ ذرہ
جسم و جاں میں

ہڈیوں میں رینگتے ہیں،
برف جیسے دُکھ ہمارے
خون میں گھلتے ہوئے
اور تہہ بہ تہہ جمتے ہوئے---

کتنے اکیلے ہیں
یہاں ہم سب اکیلے ہیں
ہمکتے، سانس لیتے
چھوٹے چھوٹے سے جزیرے
اور پہروں کا سمندر---

اس قدر کیوں رو رہے ہو
کیا ہوا جو کھو گیا کوئی
خلاؤں میں تو سُورج اور ستاروں
کا سفر بھی ٹوٹ جاتا ہے
خلاؤں میں خُدا بھی اپنا وعدہ
بُھول جاتا ہے!

چھوڑو مشکل باتیں ہیں یہ

چھوڑو مشکل باتیں ہیں یہ
تم کیا جانو،
مانا تم نے تپتے سُورج کو جھیلا ہے
تم پانی کے چھینٹے اپنے ہاتھ میں لے کر چلتے ہو
پر تم کیا جانو

اونچ اور نیچ کی
جُھوٹ اور سچ کی
بُھوک اور پیاس کی
دُکھ، افلاس کی
ساری باتیں اچھی ہیں
اور سچی بھی ہیں

میرے پاؤں میں مخمل کے موزے ہیں
اور
ہاتھوں میں ریشم کے دستانے
اسی لیے تو
میرا دل پتھر جیسا ہے
اسی لیے تو
میرا آنسو بھی جُھوٹا ہے
پاؤں مرے جلتے ہیں تو
مخمل کی نرمی میں جلتے ہیں
ہاتھ بھی میرے زخمی ہوں تو۔۔۔
چھوڑو مشکل باتیں ہیں یہ
تم کیا جانو

کیا کروں......

کیا کروں میں
آسماں کو اپنی مٹھی میں پکڑ لوں
یا سمندر پر چلوں،
پیڑ کے پتے گنوں
یا ٹہنیوں میں جذب ہوتے
اوس کے قطرے چنوں
ڈوبتے سورج کو
انگلی کے اشارے سے بلاؤں
رات میں سایہ بنوں،
خالی آنکھوں میں ہیجلے رنگ ڈھونڈوں
صاف چہرے پر سیاہی سے کوئی قصہ لکھوں،
کیا کروں میں
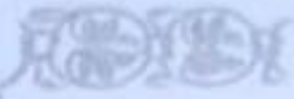
اپنے ہی پیروں سے اُلجھوں اور گروں
پھر اپنی آنکھوں سے چھپوں
اور اپنی خواہش پر ہنسوں،
کیا کروں
لاحاصلی کی سرد چادر اوڑھ لوں
اور چُپ رہوں
یا وسوسوں کے برف زاروں سے
تمہیں آواز دوں---؟

جُھوٹ

جن کو بہنا تھا وہ آنسو نہ بہے
بات کوئی ہو نہ سکی
لفظ سُوکھے ہوئے پتّوں کی طرح
پاؤں کے نیچے آئے
خون میں بہتی گِرہ کھل نہ سکی
جسم بے جان ہوا
سوچ کی ہریالی پہ بھی گرد جمی
ایسے میں ہونٹ مگر
خوب ہنسے، خوب ہنسے

دریا کی روانی وہی دہشت بھی وہی ہے
اور ڈُوبتے لمحات کی صورت بھی وہی ہے

الفاظ بھی لکھے ہیں وہی نوکِ قلم نے
اوراق پہ پھیلی ہوئی رنگت بھی وہی ہے

کیوں اُس کا سراپا نہ ہوا نقش بہ دیوار
جب میں بھی وہی ہوں مری حیرت بھی وہی ہے

کیوں برف سی پڑتی ہے کہیں شہرِ دروں پر
جب مژدۂ خورشید میں حدّت بھی وہی ہے

کیوں ڈھونڈنے نکلے ہیں نئے غم کا خزینہ
جب دل بھی وہی درد کی دولت بھی وہی ہے

رستے سے مری جنگ بھی جاری ہے ابھی تک
اور پاؤں تلے زخم کی وحشت بھی وہی ہے

تا عُمر نگاہوں کے لیے ایک سا منظر
سائے کی طرح سائے کی قیمت بھی وہی ہے

مرے سوال سے لے کر ترے جواب تلک
سفر طویل ہے ذرے کا آفتاب تلک

کسی نکھرتے ہوئے درد کی کہانی تھی
ذرا سے بیج سے پہنچی رُخِ گلاب تلک

رفاقتوں کا سفر اس کے اختیار میں تھا
فشارِ خاک سے لے کر حصارِ آب تلک

دکھا گیا ہے گزرتی رُتوں کے رنگ سبھی
شرارِ برق برستے ہوئے سحاب تلک

کوئی تو ایسا تعلق بھی ہو فسانے میں
جسے زوال نہ ہو انتہا کے باب تلک

یقیں کی بات تھی، سو رہ گئی تذبذب میں
سفر قیاس کا جاری تھا، وہ بھی خواب تلک

آنکھ سے دُور ہو گیا تو کیا
ایک لمحہ تھا، کھو گیا تو کیا

تھا اِسی کا تو انتظار ہمیں
سانحہ آج ہو گیا تو کیا

عُمر کی رات کے کنارے پر
جاگنے والا سو گیا تو کیا

صبح بے نور ہو گئی تو خیر
رات میں دن سمو گیا تو کیا

فصل تو ہم کو کاٹنی ہو گی
بیج کوئی جو بو گیا تو کیا

میرے اندر لہو نہیں باقی
حرف نشتر چبھو گیا تو کیا

اَبر کو یوں بھی تو برسنا تھا
وحشتوں کو بھی دھو گیا تو کیا

اپنی رَو میں اگر کبھی دریا
ساحلوں کو بھگو گیا تو کیا

کوئی پوچھے مرے مہتاب سے میرے ستاروں سے
چھلکتا کیوں نہیں سیلاب میں پانی کناروں سے

مکمل ہو تو سچائی کہاں تقسیم ہوتی ہے
یہ کہنا ہے محبت کے، وفا کے حصہ داروں سے

ٹھہر جائے در و دیوار پر جب تیسرا موسم
نہیں کچھ فرق پڑتا پھر خزاؤں سے، بہاروں سے

بگولے آگ کے رقصاں رہے تا دیر ساحل پر
سمندر کا سمندر چھپ گیا اُڑتے شراروں سے

مری ہر بات پس منظر سے کیوں منسوب ہوتی ہے
مجھے آواز سی آتی ہے کیوں اُجڑے دیاروں سے

جہاں تا حدِ بینائی مسافر ہی مسافر ہوں
نشاں قدموں کے مٹ جاتے ہیں ایسی رہگزاروں سے

ایلبم

سمندر

ڈوبتا سورج

سراسیمہ کنارا

اشک پیمائی

سمندر

چاند کی کرنیں

کنارا موج سے ملتا ہوا

بھرپور تنہائی

سمندر

صبح کاذب

شور
لاحاصل کنارا
سرد لاشہ
اور پسپائی

کیا معلوم

رات کے پچھلے پہر
آنکھ سے آنسو کوئی ٹپکا
تو کہاں جذب ہوا،
درودیوار سے ٹکرا کے
کوئی چیخ
کہاں ضبط ہوئی،
برف کی گود سے
دریا جو رواں تھا
وہ کہاں ٹھہر گیا،
آتشِ دہر پہ
اُڑتا ہوا اک ابر
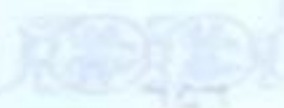
کدھر لوٹ گیا
لفظ کی لَو میں
سُلگتا ہوا اقرار
کہاں، کیسے بُجھا،
رات کے پچھلے پہر
جو بھی ہوا
کیا معلوم ہے،
کتنی آنکھوں میں جلا
اتنے سوالوں کا دیا
کیا معلوم!

نہیں رہتا جو اوراقِ سفر پر وہ نشاں ہُوں
شجر ہوں دُھوپ کی زَد پر کسی کا سائباں ہوں

جہاں بھی ہیں مرے اطراف منفی قوتیں ہیں
سمندر کی تہوں کے بیچ میں آتش فشاں ہوں

تحفظ کی ضمانت ہوں میں بینائی کی خاطر
دہکتی دُھوپ کے اور آئینے کے درمیاں ہوں

ہمیشہ حکم کے تابع معیّن راستے پر
جو رُک کے دَم نہیں لیتا کہیں وہ کارواں ہوں

مرا ماحول میرے واسطے بھی اجنبی ہے
میں اک کچی گلی کے موڑ پر پُختہ مکاں ہوں

پھر اس کے بعد رستہ کیا ہو مجھ کو سوچنا ہے
ابھی تو کچھ خبر ہے کس جگہ پر ہوں کہاں ہوں

مجھے اُس کی نظر سے دیکھ کر یہ جاننا ہے
یقیں ہوں یا یقیں کے دائرے میں بھی گماں ہوں

مجھے قوسِ قزح کی ساعتوں سے پوچھنا ہے
زمیں کا رنگ ہوں یا گہرا نیلا آسماں ہوں

بساطِ زندگی پر گھومتا اک دائرہ ہوں
جو پیہم ہو رہا ہے میں اک ایسا سانحہ ہوں

رسائی آنکھ کی میری علامت بن گئی ہے
زمیں اور آسماں کے درمیاں اک رابطہ ہوں

لہو میرا بہا ہے کربلائے خیر و شر میں
شکست و فتح کی معراج کا اک واقعہ ہوں

پگھلتے پتھروں پہ چل کے پہنچی ہوں یہاں تک
میں اک آتش فشانی سانحے کا معجزہ ہوں

مجھے جس نے بنایا اور مٹا کر پھر بنایا
اُسی کی اک کڑی ہوں میں اُسی کا سلسلہ ہوں
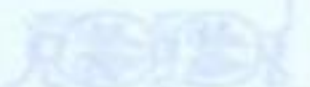
وہ میں نہیں تھی

میں کتنی دُور سے چل کر
یہاں تک آئی ہوں
پیچھے جو دیکھوں تو
کنارا ابھی نہیں ملتا
کنارا کیا
کہیں پہلے قدم کا استعارہ بھی نہیں ملتا
وہ لمحے اور وہ دِن
ماہ وسال
ان کا خیال ان کا تصور
کتنا پیچیدہ ہے،
کیسا راستہ تھا
اور کیسے کٹ گیا ہے

حصہ حصہ بٹ گیا ہے

ناتوانی میں توانائی
تھکی ہاری اُمیدوں کی پذیرائی
سخن کے موسموں کا ذائقہ زنجیر کرتی
سرد تنہائی
وہ جیسے میں نہیں تھی
مجھ میں کوئی اور تھا
احساس کی چلتی پلٹتی رَو میں
بے چہرہ دیاروں کی جبینوں پر سلگتی لَو میں
کوئی اور تھا
بے رنگ بے صورت زمیں پر
لالہ وگُل نقش کرتی کرچیوں پر
پاؤں میرے تھے
مگر بکھرا ہوا پرتَو میں
کوئی اور تھا
وہ میں نہیں تھی
مجھ میں کوئی اور تھا!

میری آواز تو کھو بیٹھی رسائی اپنی
تم بتاؤ کہ مجھے تم نے پُکارا کتنا

مجھے اک نظم لکھنی ہے

مجھے اک نظم لکھنی ہے
اک ایسے المیے پر
جس کا صورت گر نہیں کوئی
کہ یہ وہ المیہ ہے
جس کے چہرے پر
نہ آنکھیں ہیں
نہ لب ہیں
جس کے دونوں ہاتھ خالی ہیں
یہ ایسا المیہ ہے
جس کے لفظوں کو
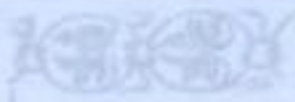
بہت گہری سیاہی میں ڈبو کر لکھا جاتا ہے
مٹا کر پھر لکھا جاتا ہے
اور پھر سے مٹا کر
زندگی کی جھانکتی درزوں میں
ایسے رکھا جاتا ہے
کہ اک لمحے کو بھی اوجھل نہیں ہوتا
یہ ایسا المیہ ہے
جس پہ ممنوعہ حدوں کی مہر ہے
پھر بھی ہزاروں نام اس کے
وقت کے سب رُوپ اس کے
صبح اس کی، شام اس کی
زخم خوردہ رات اس کی
سر بُریدہ دن بھی اس کے
یہ اک ایسا المیہ ہے
جس کی دیواروں پہ لکھی
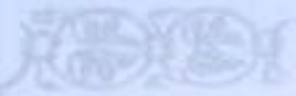
ساری تحریریں ہمیشہ
جُھوٹ کی تہہ میں چھپی رہتی ہیں
ایسی ساری تحریروں کو
ان کے سارے لفظوں کو
سیاہی میں ڈبونا ہے
دریدہ روز و شب کا جسم دھونا ہے
مجھے اِک نظم لکھنی ہے!

آسماں زمیں کے بیچ

صبح ہونے والی ہے
اک چراغ ہے باقی
اک ہراس کا لمحہ
اک قیاس کا لمحہ
آسماں زمیں کے بیچ
تیرتی ہوئی ساعت
اک ہجوم چہروں کا
ایک دشت رُوحوں کا
اپنے اپنے حصے کی
سوچ کے سمندر میں
ڈوبتی ہوئی آنکھیں

سلسلے جُدا سب کے
بولیاں جُدا سب کی
اپنے اپنے محور پر
خواہشیں جُدا سب کی
اے ہراس کے لمحے!
انتظار کس کا ہے
اے قیاس کے لمحے!
اعتبار کس کا ہے
آسماں زمیں کے بیچ
تیرنے کی ساعت پر
اختیار کس کا ہے
کسمساتے ذہنوں میں
وہم سرسراتے ہیں
دُور گہرے پانی میں
آگ سی بھڑکتی ہے
رات کے سفینے پر

روشنی سرکتی ہے
آسماں زمیں کے بیچ
تیرنے کی ساعت میں
ایک آس کی لَے پر
سب کے دل دھڑکتے ہیں
اِس طرف اُداسی ہے
اُس طرف مرا گھر ہے
صبح ہونے والی ہے

وہ رات کی اوّلیں گھڑی تھی
سحر کہیں اور ہو رہی تھی

جو دُوسروں سے چھپی ہوئی تھی
وہ بات کیوں مجھ پہ کھُل رہی تھی

حیات کی پُرسکون ندی
بپھرتے دریا میں جا ملی تھی

جو بات ہونٹوں پہ آ کے ٹھہری
ہزار لفظوں کی اک کڑی تھی

وہاں اندھیرے کا خوف بھی تھا
جہاں پہ رستے میں روشنی تھی

وہ جس میں مسکن تھا زندگی کا
نہ جانے کس شہر کی گلی تھی

پکارتا تھا جسے سمندر
وہ موج ساحل سے جا ملی تھی

جو اُڑنا چاہا تو دیکھا میں نے
حیات زنجیر ہو چکی تھی
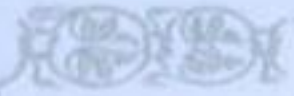
اک آہٹ پر چونکا میرے ساتھ کوئی
وقت کی تہہ میں اُترا میرے ساتھ کوئی

مٹی جب ہریالی کی خوشبو مانگے
دیکھے اَبر کا چہرا میرے ساتھ کوئی

گہرے میٹھے دریاؤں کی چاہت میں
صحرا صحرا گھوما میرے ساتھ کوئی

دُھوپ کڑی تھی پھر بھی پار چلی آئی
دشت میں ہوگا سایا میرے ساتھ کوئی

جتنا رستہ طے کرنے کی خواہش تھی
اتنی دُور نہ آیا میرے ساتھ کوئی

ایک گہرا راز ہے پیچھے مِرے
اَن سنی آواز ہے پیچھے مِرے

ماورائے حد کی ہے مجھ کو تلاش
نقطۂ آغاز ہے پیچھے مِرے

ایک جنگل کا تجسّس سامنے
شہر کی آواز ہے پیچھے مِرے

مڑ کے دیکھوں یا یونہی چلتی رہوں
لمحۂ اعجاز ہے پیچھے مِرے

ایک دروازہ کھلا ہے سامنے
اور اک دَر باز ہے پیچھے مرے

اب تو سوجا

ہر طرف
خون ہی خون ہے
رنگ ہی رنگ ہے
سرخ ملبوس کی سرسراہٹ پہ بہتا ہوا خون ہے
سبز مٹی کے ماتھے پہ جمتا ہوا خون ہے
کاسنی، زرد پھولوں پہ بکھرا ہوا خون ہے
نیلگوں آسماں پہ پڑی خون کی دھاریاں
نیلے پانی میں گھلتا ہوا خون ہے
صاف، شفاف چادر پہ خونی سفر کا نشاں
جسم در جسم ٹھہرا ہوا خون ہے
اب تو سوجا،
سیہ رات

بچپن سے،
تیری جوانی سے لمبی سیہ رات پر
میں محافظ ہوں
اور
میری آنکھوں میں اُترا ہوا خون ہے
اب تو سوجا
کہ لمبی سیہ رات کا
کچھ بھروسا نہیں
صبح کی روشنی
کیا خبر
پاس ہے،
دُور ہے---

بے زباں زمینوں کے نام

جشنِ خوابِ وحشت ہے
خاک وخوں سے ہم آغوش
ناچتے ہیں روز و شب
دُھوپ آگ جیسی ہے
رات اپنا پھن پھیلائے
رینگتی ہے پہلو میں
زخم زخم جسموں میں
زہر گھلتا جاتا ہے
عصمتوں کی چادر پر
تار تار لفظوں کا
جال بنتا جاتا ہے
ننھے منے پھُولوں کے

رنگ راکھ جیسے ہیں
ننھے ننھے ہونٹوں پر
داستاں اُدھوری ہے
کونپلوں سے چہروں کی
چاند سی جبینوں سے
نام مٹتے جاتے ہیں
برگ برگ روتا ہے
خاک سے لپٹتا ہے
خوبرو درختوں کی
شاخ شاخ کٹتی ہے
بے نشان قبروں پر
کوئی ہاتھ چاہت کا
روشنی نہیں کرتا
سب نصاب ہستی کے
سب جواز خوابوں کے
گرد ہوتے جاتے ہیں
اور محبتوں والے
اونچی نسبتوں والے

بے زباں زمینوں کے
یہ بہار گر سارے
اپنے اپنے ہاتھوں میں
پھُول لے کے پھرتے ہیں
اک دُکان سجتی ہے
مول تول ہوتا ہے
ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں
پھُول زرد پتھر کے
پھُول سرد پتھر کے

مصوّر اب لہو سے اپنی تصویریں بناتا ہے
مری تعمیر کے رنگوں سے زنجیریں بناتا ہے

سرِ احساس اب تعزیر لکھی جا رہی ہے یوں
ہمارے خواب ہیں اور کوئی تعبیریں بناتا ہے

ہمیں راہِ وفا سے دُور رکھنے کے لیے کوئی
دلوں کو سرد کر دینے کی تدبیریں بناتا ہے

وہ خود ہی حرف چُن لیتا ہے مبہم داستانوں سے
وہ خود ہی اَن کہی باتوں سے تفسیریں بناتا ہے

ہم اس کے ہاتھ کے لکھے کو پڑھ کر بھُول جاتے ہیں
بہت حیران ہوتا ہے جو تقدیریں بناتا ہے

یہ تیزی سے رُخِ انسانیت پر پھیلتا لمحہ
ہراس و یاس کی، آنکھوں میں تحریریں بناتا ہے
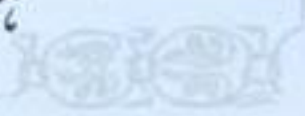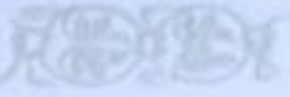
رائگاں دور کے سارے ہی سفر ہیں میرے
اسی مٹی میں سبھی لعل و گہر ہیں میرے

اپنی اک صبح کی تھوڑی سی تمازت دے دے
تجھے معلوم ہے بھیگے ہوئے پَر ہیں میرے

تیرے ہی دن سے اُجالوں کی طلب ہے مجھ کو
تیری ہی رات سے اُلجھے ہوئے ڈر ہیں میرے

کون کہتا ہے کہ موسم مرے سرسبز نہیں
کون کہتا ہے کہ بے سایہ شجر ہیں میرے

کیوں کسی اور کو تعبیر کی ہریالی دیں
کیوں نہ مجھ پر ہی کِھلیں خواب اگر ہیں میرے

اشعار

صرف ہونے اور نہ ہونے کا تسلسل ہی نہیں
رات دن کی سرحدوں پر جھٹپٹا سا بھی تو ہے

دامنِ کوہِ گراں میں آنکھ کی لَو سے نہاں
پتھروں کی اوٹ میں اک راستہ سا بھی تو ہے

کیوں عداوت ہی ہوئی سنگِ ملامت سے کشید
اس میں غم کی انتہا کا ذائقہ سا بھی تو ہے

اُس کی دانستہ خموشی کے تواتر سے کہیں
میرے ناگفتہ سخن کا رابطہ سا بھی تو ہے

تیرے طلسمی شہر میں

یہاں پر دُھوپ میں شدت نہیں ہوتی
یہاں صحرا نہیں ہوتے
یہاں ٹھہرے ہوئے دریا نہیں ہوتے
یہاں رستے کبھی بے آب، بے سایہ نہیں ہوتے
مگر اے اجنبی!
تیرے طلسمی شہر میں
جسموں پہ ہریالی نہیں اُگتی
کہیں چہرے نہیں ملتے
گزرتے موسموں کا شور ہوتا ہے
دبے پیروں کی آہٹ سے کہیں پتے نہیں ہلتے
یہاں طوفانِ ابر و باد کا ہنگام ہوتا ہے
کہیں آہستہ آہستہ سخن کرتے ہوئے چشمے نہیں ہوتے

بلا کی بھیڑ میں بہتے ہوئے یک رنگ سایوں پر
حسیں آنکھیں تو ہوتی ہیں
ان آنکھوں میں چھپے آنسو نہیں ہوتے!

سنو اے داستاں گو

سنو اے داستاں گو،
تم نے اتنا جھوٹ
کس اندھے سپیرے کی پٹاری سے چرایا
کیسے دل کی بند گٹھڑی میں چھپایا
کس کے رستے میں
زمیں سے آسماں تک
رات کی صورت اُٹھایا
زہر کی صورت بچھایا
زخم کی صورت اُگایا
تم نے اتنا جھوٹ
کس کے نام لکھا
اور کس کس کو رُلایا
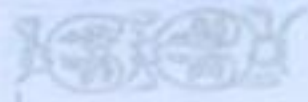
داستاں گو،
تم نے سچائی کو
کیسے سب صحیفوں سے مٹایا
کن زمینوں میں سُلایا
کس سمندر میں بہایا
داستاں گو
تم طلسمی ہاتھ رکھتے ہو کہ پتھر دل

بتاؤ،

راز سے پردہ اُٹھاؤ
اپنا چہرہ تو دکھاؤ---!

سیاہی اوڑھنے والی زمیں پر

سیاہی اوڑھنے والی زمیں پر
اجنبی لڑکی
کسی کی پسلیاں گنتی ہے
اور وہ گھورتا جاتا ہے اس کو
اُس کے میلے ہاتھ سے سُوکھا نوالہ چھین کر
وہ اپنے منہ میں ڈالتی ہے
پھر بھی وہ خالی پھٹی آنکھوں سے
یونہی دیکھتا جاتا ہے اس کو
رینگتے پندار کا نازک کھلونا توڑ دیتی ہے
مگر وہ کچھ نہیں کہتا
وہ اس کے آخری آنسو کو مٹی میں ملا دیتی ہے
وہ خاموش رہتا ہے

سیہ جسموں کی شریانوں میں کیسا خون بہتا ہے؟
وہ اس سے پوچھتی ہے
جس پہ وہ دھیرے سے ہنس دیتا ہے
اور پھر
جُھک کے اس کے دل میں خنجر گاڑ دیتا ہے!

بہار

پھول اور پتّے
خوشبو اوڑھے
رنگت پہنے
جھکتے، چھپتے
سہمے سہمے
مجھ سے باتیں کرتے ہیں
اور
میری باتیں سُنتے ہیں---
میری باتیں
اپنے دھیان میں اُلجھی باتیں
ساتھ ہَوا کے اُڑتی باتیں
اَبر کی کالی آنکھ سے گرتی
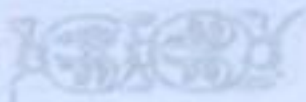
سب مٹی میں ملتی باتیں
خوش ہوتی ہیں
دُکھ کے چہرے کو دھوتی ہیں
اُجلا چہرہ دیکھ کے میرا
وہ ہنستے ہیں
وہ کھلتے ہیں
ایسے دوست کہیں ملتے ہیں؟

کوئی دیوار نہ ہے سایۂ دیوار ابھی
نظر آتے ہیں سفر کے مجھے آثار ابھی

مطمئن ہوں کہ مری آخری منزل ہے دُور
مجھ سے اُونچا ہے مرے شوق کا معیار ابھی

اپنی ہر بات کو اک عُمر نبھانا ہے ہمیں
اپنے ہی عہد میں رہنا ہے گرفتار ابھی

ایک محور پہ دل و ذہن نہیں ہیں اب تک
اک تعلق کا تقاضا ہے گراں بار ابھی

اتنی آسانی سے یہ نقش نہیں مٹ سکتا
مجھ میں زندہ ہے مری ذات کا معمار ابھی

دل سے تعزیر کا لمحہ تو گزر جائے گا
لیکن اس طرح کے احساس بکھر جائے گا

مجھ کو معلوم نہ تھا دُھوپ پڑے گی اتنی
سر پہ جب پہنچے گا سُورج تو ٹھہر جائے گا

یہ اُجالا کبھی رستہ نہیں دے گا ہم کو
رات کی طرح نگاہوں میں اُتر جائے گا

اپنی چاہت میں گرفتار ہے دُنیا ساری
پیشِ آئینہ ہر اک چہرہ سنور جائے گا

وقت سے مجھ کو توقع نہ رہے گی کوئی
اور پھر چہرۂ ایّام نکھر جائے گا

راہِ ہموار تو رکھے گی سفر کو جاری
کوئی بھٹکے گا تو پھر لَوٹ کے گھر جائے گا

ابھی اُمید چمکی تھی ابھی دُھندلا گئی ہے
جو مٹتے جا رہے تھے نقش وہ دِکھلا گئی ہے

دُعائے صبح اپنی باریابی کے نشے میں
ذرا سی دیر کی خاطر مجھے بہلا گئی ہے

خیالِ نرم رَو سے روز و شب کی ہم کلامی
مرے اندر جو پتھر تھا اُسے پگھلا گئی ہے

نہ ملنے والے رستوں کی طرح شامِ رفاقت
شکستِ خواب کے معنی مجھے بتلا گئی ہے

یہ آب و تاب جو باہر ہے اس کی تقویت سے
ترے اندر کی ساری روشنی کجلا گئی ہے

ہراس و یاس سے اُس کی تمنا تھی عبارت
ہُنر پرواز کا لیکن مجھے سکھلا گئی ہے

کوئی ٹوٹا ہوا پیمان تو ہے
ثباتِ ہجر کا سامان تو ہے

اگرچہ خون سے لکھا گیا تھا
مری ہستی کا اک عنوان تو ہے

چراغِ دل! ترا بجھنا ہی اچھا
کہ پھر سے جلنے کا امکان تو ہے

کھُلے پانی کی وسعت اور ہے کچھ
ندی میں تیرنا آسان تو ہے

اگر چاہوں تو آنکھیں بند کرلوں
کہ رستے کی مجھے پہچان تو ہے

چھڑائے ہاتھ اور چلنا سکھایا
کسی کا مجھ پہ یہ احسان تو ہے

نقص کیسا ہے مری بینائی میں
کچھ نظر آتا نہیں تنہائی میں

ڈوبنے کا کوئی تو ہوتا جواز
کچھ تو ہوتا اس قدر گہرائی میں

آ گئی سچائی کو جادوگری
چُھپ گیا تالاب سارا کائی میں

خواب ہے میرا عبارت رنگ سے
اور قدم ہیں خطۂ صحرائی میں

رات کاٹی پاؤں سہلاتے ہوئے
دن گزارا بادیہ پیمائی میں
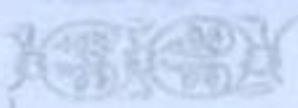
وہ نوائے فتح سے پھر جا ملا
میں نے جو نوحہ لکھا پسپائی میں

مدتوں سے ڈھونڈتی پھرتی ہوں کیا
کھو گیا کیا وقت کی پہنائی میں

فصل پک گئی ہو گی
خاک تھک گئی ہو گی

بات ہی کچھ ایسی تھی
دُور تک گئی ہو گی

مہربان جھونکے سے
لَو بھڑک گئی ہو گی

رات دُکھ کے ماتھے پر
ہاتھ رکھ گئی ہو گی

آخری دیے سے بھی
رہ چمک گئی ہو گی

مجھے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا
کوئی مجھ کو اپنا نہیں لگ رہا

کوئی بات دل کو نہیں چھو رہی
کوئی حرف سچا نہیں لگ رہا

میں دل کی عبارت کہاں پر لکھوں
ورق تیرا سادہ نہیں لگ رہا

بلا سے مری، شام آئے کہ شب
مجھے دن ہی اُجلا نہیں لگ رہا

نہ رنگِ مروت نہ رنگِ ملال
کوئی رنگ تازہ نہیں لگ رہا

کوئی چیز اپنی جگہ پر نہیں
یہ رستہ وہ رستہ نہیں لگ رہا

یہ سانسیں بھی اپنی نہیں لگ رہیں
یہ چہرہ بھی اپنا نہیں لگ رہا

کہیں سے وہ آواز آئے گی پھر
نہیں، مجھ کو ایسا نہیں لگ رہا
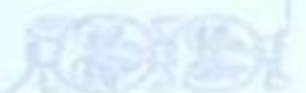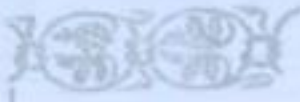
Catharsis

مجھے کچھ بھی نہیں لکھنا
مجھے تو کھُل کے رونا ہے
مجھے سر پھوڑنا ہے
چیخنا ہے
جسم سے بہتے لہو کو دیکھنا ہے

آسماں کے نیلگوں پھیلاؤ میں
کتنے پرندے اُڑ رہے ہیں
اپنی شاخوں سے بندھے ہیں
پھر بھی کیسے اُڑ رہے ہیں
مجھ کو اُڑنا بھی نہیں آتا

فلک کے بے کراں گنبد میں
رستہ بُھولنے کی آرزو ہے
اور مجھے اُڑنا نہیں آتا
جو گہری شام جیسا ہو
زمیں کی لوح پر اُس رنگ سے لکھا نہیں جاتا
جو پوری بات کہہ ڈالے
قلم کی نوک پر وہ لفظ ہی رکھا نہیں جاتا
مجھے لکھنا نہیں آتا
مجھے تو کُھل کے رونا ہے

Nightmare

تم یہیں ہو مگر
تم کہیں اور ہو
میں فضا میں معلق تنی ایک رسّی پہ جامد ہوں
اور دُوسری سمت کچھ بھی نہیں
یہ فضا کس نے تخلیق کی،
جو بصارت پہ ٹھہرا ہوا عکس
میری سماعت پہ ٹھہری ہوئی گونج ہے
کس طرف کی ہے
یہ کس زمیں کی ہے
اور میرے قدموں کی کیا سمت ہے
میرے پیچھے کوئی ہے،
کوئی ہے تو بولے

کوئی ہے تو آواز دے
حلق میرا مقفل ہے
یا میں کسی خواب میں
خوف کے زاویے پہ کھڑی ہوں
تمہیں دیکھنا کتنا آساں ہے
تم سامنے ہو
ابھی اِس طرف ہو
ابھی اُس طرف ہو
ابھی میرے پاس
مگر تم نہیں ہو
کہیں بھی نہیں ہو
فضا میں معلق تنی ایک رسّی پہ
میرے سوا اور کوئی نہیں ہے!

یہاں کچھ بھی نہیں ہو گا

مری ہستی کے جنگل میں
اچانک شور برپا ہے
مگر کچھ بھی نہیں ہوگا
کہ جنگل کے جلو میں
خوف کی پرچھائیاں سی رقص کرتی ہیں
یہ سارے شور کو اپنی صدا میں جذب کرلیں گی

مری ہستی کے جنگل میں
بہت چنگاریاں ہیں، آگ بھڑکی ہے
مگر کچھ بھی نہیں ہوگا
کہ جنگل حبس کے احصار میں ہے
اور ہوائے تازہ خو کے راستے ناپید رہتے ہیں
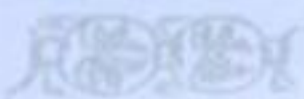
مری ہستی کے جنگل میں
کہیں پر ہلکی ہلکی روشنی سی ہے
مگر کچھ بھی نہیں ہوگا

یہ ننھی سی کرن
گمبھیر تاریکی میں رستہ بھول جائے گی

ڈرومت
شور ہو یا آگ کے شعلے کہ سورج کی کرن
جنگل بہت گہرا ہے
اس میں کچھ نہیں ہوگا
یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا
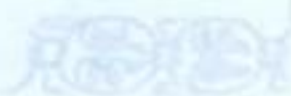
End of the Road

یہاں پر جو بھی کچھ ہے، بے سبب ہے
کوئی سُکھ
کوئی سخن
کوئی ارادہ
سب گزرتے وقت کا پرتَو ہے اور کچھ بھی نہیں ہے
جیسے چنگاری بھڑک کر راکھ ہو جاتی ہے
جیسے رنگ آب اور خاک میں تحلیل ہو جاتا ہے
جیسے ذہن سے کوئی تعلق محو ہو جاتا ہے
جیسے دل کی دھڑکن بند ہو جاتی ہے
بس یونہی
یہاں ہونا نہ ہونا ایک سا ہے
ارتقا اک واہمہ ہے
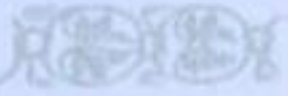
سب گزرتے وقت کی تصویر ہے بس
اور گزرتا وقت بھی کیا ہے
فقط اک دائرہ ہے
بے تعلق سی فضا میں تیرتا اک دائرہ ہے
دیکھنا کیا
جاننا کیا
سوچنا کیا
جو بھی کچھ ہے بے سبب ہے

کتابِ ہست و بود کا میں ایک باب بھی نہیں
میں داستانِ آب و خاک میں سراب بھی نہیں

تری حقیقتوں کے سامنے مِری بساط کیا
صدی کے تیز رنگ! میں تو نقشِ خواب بھی نہیں

بہ لوحِ دل شبیہِ حرفِ عام کو میں کیا کروں
مرے نصاب کی یہاں کوئی کتاب بھی نہیں

اُسی کی کوکھ میں جڑیں پکڑ رہا ہے کس لیے
وہ ایک نخل جو زمیں سے فیض یاب بھی نہیں

وہ جس کو چشمِ سادہ رنگ دیکھ لے سمیٹ لے
مری حیات کے سفر میں وہ عذاب بھی نہیں

تمہارے حکم کی تعمیل کیسے ہو
سمندر دشت میں تبدیل کیسے ہو

تجھے بویا گیا تھا بہتے پانی میں
گُلِ ہستی! تری تکمیل کیسے ہو

جہاں لفظ و معانی شور کرتے ہوں
وہاں احساس کی ترسیل کیسے ہو

سمندر میں پڑاؤ ڈُھونڈنے والے
بپھرتی موج سنگِ میل کیسے ہو

بلندی کو جسے تصویر کرنا ہے
بھلا پایاب ایسی جھیل کیسے ہو

وہ جس کو عُمر کے تیشے نے توڑا ہے
اسی پیکر کی پھر تشکیل کیسے ہو

ہر آواز کا ایک ہی چہرہ لگتا ہے
اور کچھ کچھ جانا پہچانا لگتا ہے

کہساروں کے عکس دکھاتے جادُو میں
جھیل کا پانی کتنا گہرا لگتا ہے

جانے کس کا بھید ہے اس کے لہجے میں
باتیں کرتا جو سنّاٹا لگتا ہے

بھُول رہا ہے اب جو میری دستک کو
میرے ہی گھر کا دروازہ لگتا ہے

اس نے کیا سوچا ہے مجھ کو کیا معلوم
اس کی باتوں پر پہرا سا لگتا ہے

نقص ہے آئینے میں کون بتائے گا
اپنا عکس سبھی کو اُجلا لگتا ہے
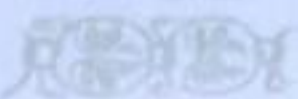
پیڑ نہ گر جائے میرا اِس موسم میں
کچھ بوجھل سا اس کا سایہ لگتا ہے

برف ہمیشہ گرتی ہے میرے اندر
رنگ کسی کا بدلا بدلا لگتا ہے

اُلجھاوے

یہ میری نیند ہے
پچھلے پہر کی منزلوں میں گم

کسی کے ساتھ میں
گہری اندھیری اک سڑک پر جا رہی ہوں
چلتی جاتی ہوں
اچانک بوندا باندی ہونے لگتی ہے
یونہی چلتے ہوئے
ہم روشنی کے اک علاقے میں پہنچتے ہیں
جہاں اک ہاتھ مجھ کو کھینچ کر

دُھندلے، بہت دُھندلے کسی رستے کی جانب
موڑ دیتا ہے

کوئی تختی فلک سے تیرتی
آ کر مرے پہلو میں گرتی ہے
سیہ رنگوں کے اس پر سانپ ہیں

پھر بھاگتی پھرتی ہوں
شاید ڈھونڈتی ہوں کچھ
اچانک سامنے گھر ہے
مگر اندر اندھیرا ہے، کوئی ڈر ہے
کہیں سے جانی پہچانی سی
دھیمی سی صدا آتی ہے
تم پاگل ہو
کس کو ڈھونڈتی ہو
اس جگہ کوئی نہیں ہے

ایک چھت ہے پھر
منڈیریں جس کی چھوٹی ہیں
یکا یک خاص سمتوں سے
بھڑکتی آگ کے شعلے برستے ہیں
حرارت اور نمی سے
جسم میرا جلنے لگتا ہے
کسی مسدود قوت سے
بجھا دیتی ہوں شعلوں کو
مگر چہرے پہ میرے
گہرے نیلے رنگ کے زخموں پہ
گاڑھے خون کے دھبّے اُبھرتے ہیں

لو اب اک ریل کے ڈبّے میں ہوں
باہر نکلنا چاہتی ہوں
اور دروازہ نہیں کھُلتا
میں فوراً دُوسری جانب لپکتی ہوں

بڑی قوت سے دروازے کے دونوں پٹ
پکڑتی ہوں
مگر اب ریل گاڑی چل چکی ہے
تیز ہوتی جا رہی ہے
پیڑ، گھر، جوہڑ
دُکانیں، کھیت، کھمبے
سارا منظر دوڑنے لگتا ہے
اور بس دوڑتا جاتا ہے

پھر میں اک کشادہ آئینے میں
اپنے قد سے
کچھ ذرا اُونچی دکھائی دے رہی ہوں
اور بھلی بھی لگ رہی ہوں
اور مرے ہمراہ
کوئی دوست چہرہ بھی
اس آئینے کے اندر جھانکتا ہے
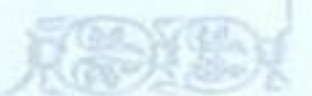
اب مرے چاروں طرف
پانی ہی پانی ہے
بہت شفاف، چمکیلا
میں جس میں بھیگتی جاتی ہوں

میرے ساتھ کیا بچے ہیں؟
میں مرمر کی ٹھنڈی سیڑھیاں چڑھتی ہوں
پھر نیچے اُترتی ہوں
کہیں پھر سیڑھیاں ہیں
جن پہ چڑھنا چاہتی ہوں تو
پھسل کر
جانے کیسے
اک کھُلے قریے میں گرتی ہوں
اکیلی ہوں
وہاں بچے نہیں ہیں
وہ کہاں ہیں، کیا ہوا

ہم سب گرے تھے؟

کیا ہوا

یہ کون ہنستا ہے

یہ میری گیلی پیشانی پہ

ٹھنڈا ہاتھ کس کا ہے

مرے پیروں کے نیچے پُل ہے

اور اس پُل کے نیچے کھائی ہے

گہری، بہت گہری

مری آنکھوں کے اُوپر دُھند ہے

یہ آنکھ کیوں میری نہیں کُھلتی

کہیں اک چیخ اٹکی ہے

ابھی ہم سب گرے تھے

کیا ہوا پھر

کیا ہوا

ہم سب گرے تھے!

کب تک ایک دُعا مانگوں گی

میرے مالک
میں نے تجھ سے جو مانگا تھا
یہ تو نہیں تھا
میں نے تجھ سے
کھویا ہوا اک دن مانگا تھا
کھویا ہوا موسم مانگا تھا
کھویا ہوا رستہ مانگا تھا
کھوئے ہوئے کچھ لفظوں کا سایہ مانگا تھا
جھیلیں، دریا، ندی، چشمے
بارش کے قطرے مانگے تھے
کھوئے ہوئے آنسو مانگے تھے
ایک ہنسی کی لَو مانگی تھی

کھوئے ہوئے کچھ دُکھ مانگے تھے
سُکھ مانگے تھے
میرے مالک
میں نے تجھ سے جو مانگا تھا
یہ تو نہیں تھا---
تو نے مجھ کو دان دیا ہے
ایک نیا سُکھ ، ایک نیا دُکھ
یہ دن ، یہ رُت ، یہ لفظوں کا سایہ
جھیلیں ، دریا ، ندی ، چشمے
بارش کے قطرے ، یہ آنسو
سارے میرے اندر ڈُوب رہے ہیں
اور میں اِن میں ڈُوب رہی ہوں
سب کچھ رُوح سے جال کی صورت لپٹ رہا ہے
سانس مری رُکتی جاتی ہے
جب یہ جال مری آنکھوں تک آجائے گا
میرے مالک

پھر میں تجھ سے کھویا ہوا اِک دن مانگوں گی
کھویا ہوا موسم مانگوں گی---
میرے مالک
کب تک ایک دُعا مانگوں گی؟
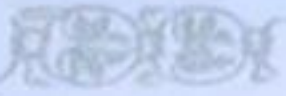
پیروں سے جو اُلجھ گیا ہے

پیروں سے جو اُلجھ گیا ہے
اس رستے پر ہو لیں گے
مٹی میں یا دُور خلا میں
خواب کہیں بھی بو لیں گے
جن کلیوں میں رنگ نہ ہو گا
ان کے ہار پرو لیں گے
بادل چاہے اُڑ بھی جائے
فرش دریچے دھو لیں گے
اُونچی دیواروں کے نیچے
دھیرے دھیرے بولیں گے
تھک جائیں گے ہاتھ ہمارے
جب بھی گرہیں کھولیں گے

دل کو نیند کہاں آئے گی
آنکھوں ہی سے سو لیں گے
بوجھ بھی جسم کا ڈھونا ہو گا
جیسے تیسے ڈھو لیں گے
تھوڑی دیر کو خوش ہو لیں گے
تھوڑی دیر کو رو لیں گے
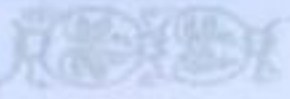
تم مری آنکھ کے تارے ہو.....

تم نے دیکھا ہے کبھی میری طرف
کون ہوں میں؟
کتنی مضبوط نظر آتی ہوں
کبھی برگد کے گھنے پیڑ کے سائے جیسی
کبھی استادہ مکاں کی صورت
اور کبھی نرم بچھونے کی طرح
صبح کی لَو کی طرح
شام کے تارے کی طرح
تند موجوں میں محبت کے کنارے کی طرح

تم نے دیکھا ہے کبھی میری طرف

کون ہوں میں؟

کتنا کمزور ہے یہ جسم مرا
کس طرح کانپتا ہے دل میرا
میں بھی ڈرتی ہوں تمہاری ہی طرح
میں بھی روتی ہوں تمہاری ہی طرح
آنکھ سے دُور
کہیں رُوح کے تہہ خانے میں
ٹوٹے پھوٹے سے کھلونے اپنے
میں نے تم سب سے چُھپا رکھے ہیں
تمہیں معلوم ہے
مجھ میں کوئی کہتا ہے مجھے
ضد کروں میں بھی تمہاری ہی طرح
رُوح کے قفل کو توڑوں اک دن
اپنی خواہش کا دریچہ کھولوں

اور جی بھر کے کھلی تازہ ہوائیں کھیلوں!

تم نے دیکھا ہے کبھی میری طرف
کون ہوں میں؟

گندی امّی

اُجلی اُجلی باتوں والا
چھوٹے چھوٹے ہاتھوں والا
اک شہزادہ
چھوٹی چھوٹی باتوں والی
اُجلے اُجلے ہاتھوں والی اک شہزادی
چور دریچوں اور دروازوں والے کمرے
ایسے کتنے کمروں والی محل سرائیں
محل سراؤں کے کمروں میں
بھُوت پریتوں والے کھیل
بھُوت پریتوں کے کھیلوں میں
ساری بھوبل جیسی باتیں

جتنے سال اور جتنی صدیاں
ان سے زیادہ دن اور راتیں
جتنے سُوکھے رُوکھے موسم
ان سے تھوڑی کم برساتیں---
رونے والی کالی بلی کیا کہتی ہے
رات کی رانی دن کو کس کی رہ تکتی ہے
رہداری میں کھڑے سپاہی کی ٹوپی میں کس کا سر ہے
تہہ خانوں میں ٹپ ٹپ کرتے کس کے تازہ خون کے قطرے
ہرے درختوں میں کس کی دو کالی آنکھیں
پتوں کی چرمر پر کس کا کالا پاؤں
پانی کے تالاب میں کتنے کالے پتھر
اک کالے پتھر کے اندر کالا موتی
کالا موتی ڈھونڈ رہی ہے
چھوٹی چھوٹی باتوں والی
اُجلے اُجلے ہاتھوں والی
اک شہزادی

کالے پتھر پر بیٹھا ہے
اُجلی اُجلی باتوں والا
چھوٹے چھوٹے ہاتھوں والا
اک شہزادہ

گندی امّی
بور کہانی
ہم نہیں سُنتے

چُھپا کے سارے دُکھوں کا حساب رکھ دُوں گی
ورائے چشمِ طرب اضطراب رکھ دُوں گی

کہیں خیال کی لَو سے ہو کوئی چشم تہی
تو ایسی آنکھ میں سب اپنے خواب رکھ دُوں گی

میں اعتبار سے دریا تراش لوں گی وہاں
حصارِ دشت سے باہر سراب رکھ دُوں گی

میں اپنے گھر کو سجاؤں گی اس طرح بھی کبھی
ہر ایک طاق میں دل کی کتاب رکھ دُوں گی

ستارے توڑ کے لانا مجھے نہیں آتا
تمہارے ہاتھ پر برگِ گلاب رکھ دُوں گی

مری بساط سے اُلجھا اگر غرُور مرا
دیا جلا کے سرِ آفتاب رکھ دُوں گی

نام اُس کا مری آنکھوں سے سمیٹا نہ گیا
بامِ افلاک پہ لکھا گیا دیکھا نہ گیا

ذات کے شہر میں اظہار کی ہر شکل بنی
بس دھڑکتا ہوا دل ہاتھ پہ رکھا نہ گیا

اس کو دانستہ کسی نے بھی معانی نہ دیئے
یہ نہیں ہے کہ مرے لفظ کو سمجھا نہ گیا

راہ کے لمس کی خواہش تھی مرے پیروں کو
کس طرف جائے گا رستہ کبھی پوچھا نہ گیا

مرے دل نے تو تھکا ڈالا مرے ذہن کو بھی
ٹھیرنا ہو گا کہیں اتنا بھی سوچا نہ گیا

ہم سب خود کو تنہا کہنا چاہتے ہیں
جُھوٹے ہو کر سچا کہنا چاہتے ہیں

اپنے خدوخال کی ہر کمزوری کو
اور کسی کا چہرا کہنا چاہتے ہیں

ڈرتے رہتے ہیں جن کی بے مہری سے
اُن لوگوں کو اچھا کہنا چاہتے ہیں

چھوٹی چھوٹی باتوں پر رونے والے
اجنبیوں کو اپنا کہنا چاہتے ہیں

آنکھوں والے کب سُنتے ہیں آنکھوں کی
سب راتوں کو اُجلا کہنا چاہتے ہیں

دل جس سے منسوب کیا ہے ہم اس کو
اپنے قد سے اُونچا کہنا چاہتے ہیں

آدھا دن اور آدھی رات

چکر کاٹے وقت کا پہیّا
چلتے چلتے دیتا جائے
آدھا دن اور آدھی رات
مٹھی میں تھوڑا سا سُورج
چاند کی اک چھوٹی سی قاش
پورے کھیل کا منتر ڈھونڈے
فیصلہ کرنے والا ہاتھ
ڈھونڈے لیکن ڈھونڈ نہ پائے
ورق ورق پر لکھتا جائے
آدھی جیت اور آدھی مات
کوئی نہ بولے اور جب بولے
لفظوں کے سنگم سے اُٹھے

دبی دبی سی اک آواز
آدھا قصہ آدھی بات
گہری نیند سے کوئی جگائے
آئے، ہاتھوں پر رکھ جائے
کوری مٹی کی سوغات
مٹی کے باوے بن جائیں
باوے رشتوں میں بٹ جائیں
رشتے مانگیں سچا ساتھ
سچے ساتھ کا مطلب پوچھے
ہر رشتے کی اوٹ میں جلتی
آدھی میں اور میری ذات

حصار بے در و دیوار

(۱۹۹۱)

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ مجھ کو میرا خالق
بنانا چاہتا ہے یا مٹانا چاہتا ہے
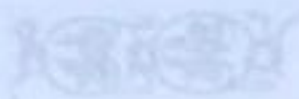
حصارِ بے در و دیوار

(۱۹۹۱)

انتساب

چھاؤں بنانے چھاؤں اُٹھانے والے مولیٰ
میں نے تیرے اسم کا سایہ ڈھونڈ لیا ہے

اپنے رب کے نام

فہرست

عقیدت

تمام رنگوں میں ایک ہی رنگ مختلف ہے
وہی ازل ہے وہی ابد ہے
وہی محبت کے استعاروں کی روشنی ہے
وہی عقیدت کی آخری حد
وہ دائمی رنگ
جس میں باقی تمام تر رنگ مِل رہے ہیں
نموئے وحدت سے کِھل رہے ہیں!

رسائی کا قرینہ آنکھ میں ہے
زہے قسمت مدینہ آنکھ میں ہے

میں تیرے شہر کی جانب رواں ہُوں
سرِ دریا سفینہ آنکھ میں ہے

ترے دستِ رسا میں بابِ رحمت
شفاعت کا خزینہ آنکھ میں ہے

نہ چھٹنے دیکھنا یہ تشنگی سے
طلب کا آبگینہ آنکھ میں ہے

جلا دے اس کو اپنی روشنی سے
دُعاؤں کا نگینہ آنکھ میں ہے

مقیّد عرصۂ ایثار میں ہُوں
حصارِ بے در و دیوار میں ہُوں

سپردِ شب نہ مجھ کو کیجیے گا
ہویدا صبح کے آثار میں ہُوں

مری آنکھیں گواہی دے رہی ہیں
کسی اُمید کے آزار میں ہُوں

اُجالا دیکھ تو سکتی ہُوں لیکن
ابھی تک فیصلوں کے غار میں ہُوں

جسے اُس نے عقیدت سے لکھا تھا
میں پوشیدہ اُسی کردار میں ہُوں
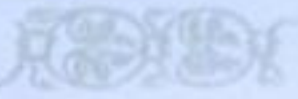
میں اِک حرفِ مکمل ہو تو جاؤں
کسی کی لغزشِ گفتار میں ہُوں

مرے کاندھوں پہ ہے بارِ امانت
یقیناً لمحۂ بیدار میں ہُوں

قریۂ درد پہ دیوار اُٹھائے رکھنا
ساکھ جب بن ہی گئی ہے تو بنائے رکھنا

رہ گزر پر نہ سہی تیز ہوائیں ہیں اگر
گھر کے اندر تو چراغوں کو جلائے رکھنا

ناگہاں کوئی نہ آثار مٹا دے اس کے
نقش اِک اور پسِ نقش بنائے رکھنا

بات پردے سے تصنّع کے جھلک جائے گی
اس لئے زخم تہہِ زخم چُھپائے رکھنا

موسمِ خشک میں خوشبو کا تصور تو رہے
طاق میں پھُول کی تصویر سجائے رکھنا

کوئی تو لمحہ ہو جب زندگی سفر میں نہ ہو
چراغ گھر میں جلے شامِ رہ گزر میں نہ ہو

اِنہیں ہمیشہ ہی رہتا ہے دستکوں سے گریز
مِری ہی رُوح کہیں میرے بام و در میں نہ ہو

اُسے تلاش کیا جائے دستِ خالق میں
کمی جو نقش میں لگتی ہے نقش گر میں نہ ہو

مری ہی خو میں نہ ہو اُس کی رنجشوں کا سبب
یہ فاصلہ کہیں میرے ہی بال و پر میں نہ ہو

ہَوا چلی بھی نہیں اور لڑکھڑانے لگی
دیئے کی لَو مہ و خورشید کے ہی ڈر میں نہ ہو

فقط ساحل پہ بیٹھے بے بسی کی خاک اُڑاؤں
کہ تند و تیز موجوں کی طلب میں ڈُوب جاؤں

سمندر سے مرا رشتہ بہت گہرا ہے لیکن
کبھی پتھر کے ٹیلوں کی روش بھی آزماؤں

بہت گہری تپش کے بعد کی بارش نے سوچا
میں کیسے اِس زمیں پر اِک نیا طوفان لاؤں

مزاجِ موسمِ گریہ کو بھی تو یاد رکھوں
میں جب احساس کی مٹی سے اپنا گھر بناؤں

تصرّف میں تو آئے مرہمِ آسُودگی بھی
اُسے بھی زخم دوں اور خود بھی گہری چوٹ کھاؤں

میں اپنے دل کے دروازے پہ بیٹھی سوچتی تھی
اسے باہر سے بھیڑوں یا پھر اندر لوٹ جاؤں

کس قدر پیڑ وہ تناور ہے
جس کے سائے کا دُھوپ کو ڈر ہے

ساحلوں کا قیاس کیا جانے
کتنا گہرا کوئی سمندر ہے

ہم مقیّد قفس کے اندر ہیں
شور لیکن قفس کے باہر ہے

کیسے پَت جھڑ کے ہاتھ آئے گی
شاخِ گُل جو شجر کے اندر ہے

ہیں تناظر الگ الگ اپنے
ایک آنگن ہے ایک ہی گھر ہے

محشرِ وقت میں اِس آنکھ نے کیا کیا دیکھا
سُرخ راتیں تو کبھی زرد اُجالا دیکھا

پیشِ گرداب عقیدت نے ڈبو دی کشتی
قامتِ شوق نے دلدل میں کنارا دیکھا

حیرتِ دید نے افلاک و زمیں پر اک ساتھ
ڈُوبنے اور اُبھرنے کا تماشا دیکھا

چند لمحوں کے لئے ایک ہوئے شام و سحر
ڈُوبتے دن کی معیت میں ستارا دیکھا

چھین لی پیاس کی وسعت نے ترائی اُسکی
کس نے صحراؤں کی آغوش میں دریا دیکھا

کم سے کم جان گئے قیمتِ اُمید ہے کیا
عُمر بھر بیٹھ کے جب ایک ہی رستہ دیکھا

اس کی مٹی پہ اُگانی ہے نئی فصل مجھے
وحشتِ یاس نے جس کھیت کو جلتا دیکھا

ساحل کو لہروں کا شور سُنائی دے
قرب سمندر کا کتنی پہنائی دے

ایک اک قطرہ جذب کرے، تر سے پھر بھی
دشت گھنیرے بادل کو رُسوائی دے

ڈُوبنے والے کا اندیشہ ہی اکثر
قطرہ قطرہ پانی کو گہرائی دے

بدلی بدلی رُت کے چہرے پر آخر
رنگ پرانا کوئی تو دکھلائی دے

یاس کی آندھی قریہ قریہ دُھول اُڑائے
آس کا غازہ لمحوں کو زیبائی دے

جس نے پھُول چُنے ہیں میرے صحرا سے
میری آنکھوں کو اپنی بینائی دے
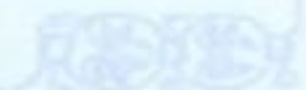
سُلگتے پتھروں پر پھر چلیں کیا
تلاشِ راہِ گم گشتہ کریں کیا

سمندر سے تو خالی ہاتھ لَوٹے
کسی کے سیپ سے موتی چنیں کیا

تپش ہو دُھوپ کی تو بات بھی ہے
شجر کے سائے میں بیٹھے جلیں کیا

جَرس ہے کاروانِ بے دِلی کا
یہی آواز ہر لحظہ سُنیں کیا

نئے وقتوں کے ہم پالے ہوئے ہیں
پرانے عہد کے بھی دُکھ سہیں کیا

یہ رستہ ختم ہونے کا نہیں ہے
ثباتِ تشنگی بتلا کریں کیا

ایک قریہ ہے کسی یاد کا اس شہر کے بیچ
جیسے تریاق کا چھینٹا ہو نمِ زہر کے بیچ

ایسے یکجا ہو تری موج مرے ساحل سے
ریت کا ڈھیر ٹھہر جائے کہیں لہر کے بیچ

میں نے دیکھا ہی نہیں لوگ بتاتے ہیں مجھے
چاند تھا رقص کناں رات گئے نہر کے بیچ

سطحِ برفاب یہ محسوس نہیں کر سکتی
کس قدر آگ دہکتی ہے اِسی دہر کے بیچ

ابھی تاریکیوں کا سامنا ہے
ہمیں اپنے ہی اندر جھانکنا ہے

سفر میں شام ہوتی جا رہی ہے
کسی سے راستہ بھی پوچھنا ہے

مِرے احساس کی مجبوریاں ہیں
اسے پیچھے بھی مُڑ کر دیکھنا ہے

جمے دریاؤں کی کچی زمیں پر
قدم رکھنے سے پہلے سوچنا ہے

چکانی ہے اِنہیں ساحل کی قیمت
ہماری کشتیوں کو ڈُوبنا ہے

بلاعنوان ہیں صبحیں ہماری
ہمیں سُورج سحر میں ٹانکنا ہے

نہیں دیوار کوئی راستے میں
سفر حائل ہوا ہے فاصلے میں

مِرا چہرہ ہے برسوں کی کہانی
بہت کچھ دیکھتی ہُوں آئنے میں

کئی نقطے پسِ اِبلاغ ہوں گے
بہت کچھ چھپ گیا ہے دائرے میں

مِرے انکار کی تلخی نمایاں
تمہاری بات کے ہر زاویئے میں

بساطِ ظرف کی ٹیڑھی لکیریں
بھٹکتی گفتگو کے حاشیے میں

کسی کی جستجو بنیاد ٹھہری
مِری تعمیر کے ہر فیصلے میں

نہ جواب ہُوں کسی بات کا نہ سوال ہُوں
فقط ایک حیرتِ مستقل کی مثال ہُوں

میں وہ کیف ہُوں جسے انتظار کی خو ملی
سرِ وقت ساعتِ دید ہُوں نہ وصال ہُوں

ہُوں سراغ نقطۂ درمیاں کی کلید کا
نہ عرُوج کی کوئی حد ابھی نہ زوال ہُوں

سرِ دشت نقشِ سراب کی رہی منتظر
جسے تابِ درد ہے وہ نگاہِ کمال ہُوں

مجھے فکر کے کسی آئنے میں ملو کبھی
کہ جو جسم و جاں سے ہے ماورا وہ جمال ہُوں

اب سمندر اور کنارا ایک سا ہے
شب زدوں کو ہر نظارا ایک سا ہے

گاہے گاہے کچھ مناظر مختلف ہیں
اصل میں رستہ ہمارا ایک سا ہے

ہم انا کی راہ کے ایسے مسافر
جن کی قسمت کا ستارا ایک سا ہے

اب کہی اور اَن کہی میں فرق کیسا
بے حسی کو ہر اشارا ایک سا ہے

لمحہ لمحہ زندگی کا عکس میں نے
جتنا وحشت میں اُتارا ایک سا ہے

جس طرح کردار ہے لازم کہانی کے لئے
شرط ہے پھُولوں کا ہونا باغبانی کے لئے

پھر اُسے الزام کی زنجیر پہنائی گئی
جو ہدف کمزور نکلا بدگمانی کے لئے

قحطِ موسم دیکھئے ہے انتہا پر آج کل
خشک پتوں کی طلب ہے گُل فشانی کے لئے

موندنا آنکھیں وہ میرا اعتبارِ وقت میں
اک بہانہ تھا بلائے ناگہانی کے لئے

اُسکی بینائی پہ پھیلی تیرگی میں چھپ گیا
اک دیا رکھّا ہوا تھا جو نشانی کے لئے

قافلے والوں سے کوئی رابطہ رکھّے تو ہے
منتخب جو ہو گیا ہے پاسبانی کے لئے

میں دن کو دن لکھوں یا رات لکھوں
جو چونکا دے اُسے وہ بات لکھوں

یہ حکمِ لمحۂ چارہ گری ہے
خزاں کے قہر کو برسات لکھوں

جو دیکھوں آنکھ سے اُس پر نہ جاؤں
جو چاہوں صورتِ حالات لکھوں

لکھوں کھیتوں کے جل جانے کا قصہ
تو بار آور رُتوں کو ساتھ لکھوں

یقیں کے دائروں کا ٹوٹ جانا
اِسے اپنی کہ اُس کی مات لکھوں
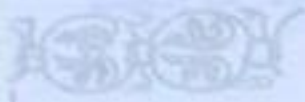
حصارِ ظرف سے لاؤں نہ باہر
جسے اپنے عدو کی گھات لکھوں

حدِ امکاں کی صورت ہی نہ ہو پھر
میں جب حرفوں میں حرفِ ذات لکھوں

خواب یوں دائروں میں آتے ہیں
موجۂ گرد چھوڑ جاتے ہیں

وہ بھی ہنستے ہیں سرد باتوں پر
ہم بھی کوشش سے مسکراتے ہیں

ساحلوں سے فرار کی خاطر
بہتے پانی پہ گھر بناتے ہیں

گُل کھِلاتے ہیں ہم چٹانوں پر
پتھروں سے دیا جلاتے ہیں

کاغذی پیرہن خراج اُن کا
لوگ جو خلعتیں بناتے ہیں

ہم نہیں بیچتے ضمیر اپنا
آرزُوؤں کا بوجھ اُٹھاتے ہیں

جانے والے موسموں کو دُور سے آواز دو
اپنی آشفتہ سری کو آخری اعزاز دو

گُل کِھلانے کے لئے بیتاب ہو مٹی مری
ذات کی ویرانیوں کو پھر وہی انداز دو

زندگی سے جیت جانے کی تمنا ہے مجھے
ایک طرفہ بے نیازی کا مجھے بھی راز دو

انگلیاں زخمی ہیں اور ڈستی ہے خاموشی مجھے
خود بخود بجنے لگے جو، اِس طرح کا ساز دو

کھوجتے تاریکیوں میں تھک گئیں آنکھیں مری
انتہائے شب کو صبحِ دید کا آغاز دو

ربط ہو جائے تخیل کا رہِ افلاک سے
طائرِ بے بال و پر کو مژدۂ پرواز دو

سوچنے بیٹھوں تو پھر اُٹھا نہ جائے
سلسلہ اوہام کا توڑا نہ جائے

اختیاری بات بھی بس میں نہیں ہے
سائے کی آغوش میں ٹھہرا نہ جائے

اُس سے خوئے بندگی کے باوجود اب
پاؤں جلتے فرش پر رکھا نہ جائے

اِک تعلق کے سنہرے تذکرے میں
آخری لمحات کو لکھا نہ جائے

کتنا اچھا ہے عقیدت کا تقاضا
جس کو پوجا ہے اُسے پرکھا نہ جائے
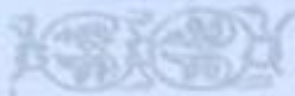
کیوں طلوعِ زیست کی معصومیت کو
اے غروبِ زندگی دیکھا نہ جائے

گہری خاموشی یہی دُہرا رہی ہے
اب کسی اُمید سے اُلجھا نہ جائے

درد کا ذائقہ آج اچھا لگا
آگ کو سوچنا آج اچھا لگا

میرے ہاتھوں میں پتھر ہی تھے اس لئے
آئنہ توڑنا آج اچھا لگا

زیست کے نقش دُھندلے لگے اس قدر
موت سے کھیلنا آج اچھا لگا

ساری سَمتیں مجھے ایک سی ہوگئیں
راستہ بھولنا آج اچھا لگا

اشک آثار لشکر کے احصار کا
خود بخود ٹوٹنا آج اچھا لگا

سچ کی حُرمت لٹائی گئی اِس طرح
جھوٹ ہی بولنا آج اچھا لگا

صبر سا آ گیا حسِ آزار کو
تم کو بھی چھوڑنا آج اچھا لگا

کبھی نفرتوں کبھی چاہتوں کے کھچاؤ میں
ہیں رکاوٹیں مری زندگی کے بہاؤ میں

مِری رُوح شل ہے تو کیا کروں مجھے کیا پتہ
کہ گریز کیوں ہے رفاقتوں کے الاؤ میں

وہ جو نقش مجھ سے بنا نہیں اُسے کیا خبر
مِرا دستِ شوق ہے سازشوں کے دباؤ میں

مِری بات بات کے آئنے میں جھلک اُٹھا
وہ جو طنز تیر سا رہ گیا مِرے گھاؤ میں

کوئی بات میری سمجھ میں آئے بھی کس طرح
کئی رنگ ہیں تری گفتگو کے رچاؤ میں

کسی روشنی کے نصیب میں ہو مِرا لہو
میں بھی کام آؤں محبتوں کے سبھاؤ میں

سلسلہ ٹوٹا ہے کیسی بات پر
جم گئی ہے برف سی برسات پر

قصہء تضحیک ہے کارِ جنوں
لوگ ہنستے ہیں کسی کے ساتھ پر

روشنائی کا تصرّف دیکھنا
نامکمل ہیں لکیریں ہاتھ پر

اک اُجالے کے قفس میں بیٹھ کے
میں نے لکھّی ہے کہانی رات پر

تِلملایا کوئی مجھ کو ہار کے
میں ہوئی حیران اپنی مات پر

مٹی کی نمی شاخِ ثمردار کے اندر
خالق کا لہو جس طرح شہکار کے اندر

زنداں سے نکلنے کی گھڑی بیت چکی ہے
در ڈھونڈ رہے ہو ابھی دیوار کے اندر

لہجے نے معانی کا بھرم توڑ دیا ہے
آوازۂ انکار ہے اقرار کے اندر

مرکز بھی وہی ہے مِرا محور بھی وہی ہے
بس بے طلبی ہے مری رفتار کے اندر

دیکھے سے نظر آیا نہیں چہرۂ گُل میں
جو رنگ جھلکتا رہا مہکار کے اندر

مقتولِ روایت کا لہو پونچھ رہی ہے
دیکھو نہ کوئی زخم ہو تلوار کے اندر

درِ امکاں! ترے کھُلنے سے پہلے
اسیرِ نقش ہُوں مٹنے سے پہلے

مجھے بے مائیگی کا دُکھ نہیں تھا
اندھیرے میں دیا جلنے سے پہلے

زمیں پر آسماں کی کھوج میں ہے
جو پنچھی گر گیا اُڑنے سے پہلے

رُتوں کے لمس کو محفوظ کر لو
تغیّر کی ہَوا چلنے سے پہلے

بھلا لگتا تھا موسم بارشوں کا
تمہیں دریاؤں کے بھرنے سے پہلے

منازل کے تھے خدوخال روشن
سفر کا آئنہ ملنے سے پہلے

کسی کے غم کی بابت سوچ لینا
کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے

مٹی کو بھی بِدل سکتا ہے
تُخمِ عداوت پھل سکتا ہے

بجھے چراغوں سے بھی ڈرنا
گھر اِن سے بھی جل سکتا ہے

زعمِ مہارت رکھنے والا
چال غلط بھی چل سکتا ہے

پُل پر پہرا دینے والے
دریا راہ بدل سکتا ہے

دستِ شفاعت انجانے میں
کیا کیا پھول مسل سکتا ہے

پانی جم کر برف ہُوا جب
پتھر کیسے پگھل سکتا ہے

لہو رُلانے والا لمحہ
تم چاہو تو ٹل سکتا ہے

وقت تم کیسے مسیحا ہو مجھے بتلاؤ
مِرے آئینۂ ایّام کا رُخ چمکاؤ

اسکی یورش میں کبھی درد کی گیرائی تھی
اور اب عالمِ تنہائی میں ہے ٹھہراؤ

میں اُسے حرف میں محبوس نہیں کر سکتی
جس تخیل سے مِری ذات میں ہے پھیلاؤ

خشک مٹی سے نہ ہے تیز ہواؤں سے گِلہ
یہاں پھُولوں نے ہی پھُولوں پہ کیا پتھراؤ

اُس کے پہلو سے برآمد کرو چشمہ کوئی
سنگِ احساس سے ایسے ہی نہ سر ٹکراؤ

مثالِ عکس مِرے آئنے میں ڈھلتا رہا
وہ خدوخال بھی اپنے مگر بدلتا رہا

میں پتھروں پہ گری اور خود سنبھل بھی گئی
وہ خامشی سے مرے ساتھ ساتھ چلتا رہا

اُجالا ہوتے ہی کیسے اُسے بجھاؤں گی
اگر چراغ مِرا تا بہ صبح جلتا رہا

میں اُسکے معنی و مقصد کے سنگ چنتی رہی
وہ ایک حرف جو احساس کو کچلتا رہا

زمیں خلوص کی مٹی سے بے نیاز رہی
رفاقتوں کا شجر واہموں پہ پلتا رہا

اُڑتی ہے گرد یورشِ حالات کی طرح
موسم ہے سرد رنجِ ملاقات کی طرح

خاموش ہے ہَوا بھی بلندی کے دوش پر
بے وزن ہو رہی ہے تری بات کی طرح

مرکز بدل رہا ہے حدوں کی تلاش میں
شہرِ تغیرات ترے ساتھ کی طرح

بدلا ہوا حیات کا مفہوم ہے کہ اب
ہر سانس ہو گئی ہے مناجات کی طرح

تسکینِ زندگی کے لئے ایک رابطہ
دوشِ ہَوا پہ رکھے ہوئے ہاتھ کی طرح

وہ لمحہ آج بھی ہے سحر کی تلاش میں
پھیلا بساطِ وقت پہ جو رات کی طرح

خوشبو و رنگ کا سوال کہاں
پھُول میں خوئے اندمال کہاں

روشنی کے لئے نہ دَر کھولے
تیرگی میں وہ اب کمال کہاں

کس توازن کی بات کرتے ہو
ذہن کا دل سے اتصال کہاں

ساری وحشت محبتوں سے تھی
اب وہ اندیشۂ ملال کہاں

عکس ہی جب نہ تھا پر کھتے کیا
ڈھونڈتے آئنے میں بال کہاں

ساعتیں غم گسار ہوں جن کی
دسترس میں وہ ماہ و سال کہاں

شکستِ شوق میں کیا صورتِ تصویر ہو گی
وجودِ ذات کی تخریب یا تعمیر ہو گی؟

مسافت تو تمہارے ساتھ ہی میں طے کرونگی
مسلسل پاؤں میں لیکن مِرے زنجیر ہو گی

یہ نصفِ راہ میں جو چشمِ نم سے جھانکتا ہے
بہت اُلجھی ہوئی اس خواب کی تعبیر ہو گی

اَنا کا پُل بنایا گر سزا کے راستوں پر
تو دریا پار کرے میں بہت تاخیر ہو گی

بھلا کیا سوچ سکتے تھے کہ صَرفِ داستاں میں
تمہارے لفظ ہوں گے اور مِری تشہیر ہو گی

مقامِ انتہا ہے اِس سے گہری رات کیا اب
سفر کے عہد کی یہ آخری تعزیر ہو گی

یہ کیسی ضد ہمارے درمیاں ہے
کہ جس میں دونوں جانب ہی زیاں ہے

مجھے لہریں کہاں لے جا رہی ہیں
جزیرے پر تو خطرے کا نشاں ہے

یہ کس پیرائے میں ہے گفتگو اب
نہ میری ہے نہ یہ اُس کی زباں ہے

کہیں کے پتھروں میں بھی سلیقہ
کہیں کا اَبر بھی نامہرباں ہے

چھپی جاتی ہے اس میں شعلگی بھی
فضائے شہر میں کتنا دُھواں ہے

سبھی رہبر سبھی بے راہ رَو ہیں
بہت بکھرا ہوا یہ کارواں ہے

یہ عقدہ تو بلندی پر کھلے گا
زمیں اُوپر ہے نیچے آسماں ہے

یہاں سے وسوسے اب جا چکے ہیں
کسی کا منتظر خالی مکاں ہے

خوابوں اور خیالوں کا اک شہر بنایا رستے میں
پھر اُسے پانے کی خواہش کا بیج لگایا رستے میں

خواب نگر پہنچے تو دیکھا وہ بھی رستے جیسا ہے
ہم نے یونہی دربدری کا بوجھ اُٹھایا رستے میں

تم کو منزل تک پہنچا کے میں بھی تھک کر بیٹھ گئی
لیکن تم سے ہم سفری کا عہد نبھایا رستے میں

میرے بعد جو آنے والا ہے مجھ سا انجان نہ ہو
اُس کے اندیشے کی خاطر دِیا جلایا رستے میں

جس نے میرا رخت بھی چھینا اور پھر مجھ کو قتل کیا
اُس نے میرے لہو سے اَن مٹ نقش بنایا رستے میں

قریہ قریہ گھومنے والا بے مایہ ہی لَوٹ آیا
دید کا کوئی ساگر لمحہ ہاتھ نہ آیا رستے میں

اپنوں کے جُھرمٹ میں دل کچھ اور بھی سُونا لگتا ہے
ایک کسی کے جانے سے ہر شخص پرایا لگتا ہے

تم نے کتنی کاوش سے مرے دل میں نفرت بوئی تھی
نخل مگر اس نفرت کا اب بے سرمایہ لگتا ہے

کچھ کھاری ہے کچھ پھیکی ہے اور کچھ تلخ ہے تنہائی
لیکن اِس تنہائی کا اب ذائقہ اچھا لگتا ہے

اِدھر اُدھر دیکھو تو کچھ ہیں میٹھے سوندھے لمحے بھی
لیکن اِن لمحوں کا ہونا آنکھ کا دھوکا لگتا ہے

اسی تحیّر میں رہتا ہے ڈُوبنے والے کا احساس
کیوں دریا کا گہرا دامن اُسے کنارا لگتا ہے

حرف مرے کیوں روئے روئے صرف اُداسی لکھتے ہیں
آج مجھے کیوں سُورج بھی بے نور کنایہ لگتا ہے

دل ہے روپوش نظاروں کی طرح
شہر سے دُور دیاروں کی طرح

ہم سمندر کی تواضع کے لئے
ایستادہ ہیں کناروں کی طرح

ریزہ ریزہ ہیں پہ موجود تو ہیں
وہ جو ٹوٹے ہیں ستاروں کی طرح

ہم سے بھی فتح کے معنی پوچھو
ہم گرے شاہ سواروں کی طرح

اس کی تعظیم عبادت سے کرو
دل ہے پاکیزہ، سپاروں کی طرح

اب ہے سمتوں کا تعین مبہم
اس کے ناپید اِشاروں کی طرح

وہ مِرا نقشِ محبت لے کر
کھو گیا راہ گزاروں کی طرح
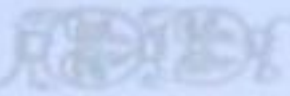
اِک بے پناہ رات کا تنہا جواب تھا
چھوٹا سا اِک دیا جو سرِ احتساب تھا

رستہ مرا تضاد کی تصویر ہو گیا
دریا بھی بہہ رہا تھا جہاں پر سراب تھا

وہ وقت بھی عجیب تھا، حیران کر گیا
واضح تھا زندگی کی طرح اور خواب تھا

پہلے پڑاؤ سے ہی اسے لَوٹنا پڑا
لمبی مسافتوں سے جسے اجتناب تھا

پھر بے نمو زمین تھی اور خشک تھے شجر
بے اَبر آسماں کا چلن کامیاب تھا

اِک بے قیاس بات سے منسوب ہو گیا
پھیلا ہُوا حروف میں جو اضطراب تھا

اپنی نگاہ پر بھی کروں اعتبار کیا
کس مان پر کہوں وہ مرا انتخاب تھا

سنہری حرف تو لکھے ہوئے ہیں
مگر معنی بہت اُلجھے ہوئے ہیں

ستم کا ربط اُن کے درمیاں ہے
اگرچہ سانحے بکھرے ہوئے ہیں

ستارا بستیوں کا چُھپ گیا ہے
یہاں جنگل بہت پھیلے ہوئے ہیں

اندھیرے کی طوالت کا نتیجہ
کنارے صبح کے جھلسے ہوئے ہیں

کوئی بچھڑا نہ ہو گا قافلے سے
دیے تو طاق میں رکھے ہوئے ہیں

ابھی ہموار ہے سطحِ محبت
مسافر سائے میں بیٹھے ہوئے ہیں

چلے ہیں سب سمندر کے سفر پر
سرِ ساحل مگر سہمے ہوئے ہیں

ہیئتِ گُل تو بے معانی ہے
رنگ و خوشبو کی سب کہانی ہے

ناؤ کا فرش ہے مِرا مسکن
اور سمندر کی پاسبانی ہے

ذات کی ٹوٹ پھوٹ کا منظر
رشکِ آفاتِ ناگہانی ہے

راہ صحرا کی منتخب کرنا
یہ ارادہ تو امتحانی ہے

تا بہ شب سب چراغ جلتے ہوں
یہ نظارہ تو آسمانی ہے

ایک قطرہ ہے یہ ندامت کا
تا بہ حدِ نظر جو پانی ہے

حرفِ دشنام کو سجا رکھوں
یہ تری آخری نشانی ہے

کاسۂ دستِ طلب میں فاصلہ رہ جائے گا
پا بہ زنجیرِ فغاں حرفِ دُعا رہ جائے گا

اک مقامِ آگہی پر خواہشیں مَر جائیں گی
منزلیں ناپید ہونگی، راستہ رہ جائے گا

روشنی کو اِس طرح ہو گی اندھیرے سے شکست
ختم ہو جائے گی شب، جلتا دیا رہ جائے گا

عکس دکھلائے گا لیکن قطرۂ خوں کے عوض
ہاتھ میں ٹوٹا ہوا جو آئنہ رہ جائے گا

منتقل ہوتے رہیں گے ایک اک کر کے مکیں
اور مٹی کا گھروندا دیکھتا رہ جائے گا

کیا تھا اس اُجڑے مکاں کے بند کمروں میں جسے
یاد کی دہلیز پر دل ڈھونڈتا رہ جائے گا

داستاں تو ختم ہو جائے گی دُہرانے پہ بھی
چشمِ حیراں میں نمی کا سلسلہ رہ جائے گا

گُل سرِ شاخ کھل گیا پھر سے
جُھک گیا تھا جو سر اُٹھا پھر سے

تیز آندھی سے آشنائی کا
منتظر تھا دیا جلا پھر سے

محو ہونے لگی تھی گہرائی
زخم کو آئنہ ملا پھر سے

سخت جاں ہے نہ سخت قالب ہے
زندگی نے کسے چُنا پھر سے

راس آنے لگی تھی تنہائی
ساتھ یہ کون ہو لیا پھر سے

موسموں نے مفاہمت کر لی
برف پر شہر بس گیا پھر سے

دولتِ درد سمیٹو کہ بکھرنے کو ہے
رات کا آخری لمحہ بھی گزرنے کو ہے

خشت در خشت عقیدت نے بنایا جس کو
ابرِ آزار اُسی گھر پہ ٹھہرنے کو ہے

کشتِ برباد سے تجدیدِ وفا کر دیکھو
اب تو دریاؤں کا پانی بھی اُترنے کو ہے

اپنی آنکھوں میں وہی عکس لئے پھرتے ہیں
جیسے آئینۂ مقسوم سنورنے کو ہے

جو ڈبوئے گی نہ پہنچائے گی ساحل پہ ہمیں
اب وہی موج سمندر سے اُبھرنے کو ہے

کنجِ تنہائی میں کھلتا ہے تخیل میرا
اور میں خوش ہوں کہ یہ گُل پھر سے نکھرنے کو ہے

جن ارادوں کا دفینہ رہِ پامال میں ہے
ذکر اُن کا بھی ضروری مرے احوال میں ہے

میں نے ناکردہ گناہوں کو نہ تسلیم کیا
بس یہی جُرم مرے نامۂ اعمال میں ہے

سرِ احساس مناظر جو کبھی روشن تھے
عکس اب اُنکا مری رُوح کے پاتال میں ہے

آنے والا کوئی لمحہ اُسے بیدار کرے
اس توقع کی سزا میرے مہ و سال میں ہے

نظر آتا نہیں ادراک کے آئینے میں
یہ تغیر جو محبت کے خدوخال میں ہے

اُسکی پرواز کی حد دُور ہے اِس بستی سے
اسکا اغماز ابھی اُسکے پروبال میں ہے

چھوڑ دوں یا اسے اندوہِ قفس میں رکھوں
ایک اُمید کا طائر جو مرے جال میں ہے

کیسے دریا ہو جو سیراب نہیں کر سکتے
دشت کو جادۂ مہتاب نہیں کر سکتے

نغمگی چھین تو سکتے ہو سجل باتوں سے
حرف کو جنبشِ مضراب نہیں کر سکتے

چاہتے ہیں کہ بھلا دیں وہ شب و روز مگر
چشمۂ زیست کو بے آب نہیں کر سکتے

سنگ باری کے عوض کرتے ہیں گوہر باری
موجۂ ظرف کو پایاب نہیں کر سکتے

نامکمل ہے تو پھر یونہی رہے زیست کہ اب
اِس کو دُہرایا ہوا باب نہیں کر سکتے

عقیدت کے شمارے مختلف ہیں
تمہارے نقش پارے مختلف ہیں

یہ قیدِ زندگی ہے اِس کی حد میں
قضا کے استعارے مختلف ہیں

جہاں دریا سمندر ہو رہا ہے
وہاں اُس کے کنارے مختلف ہیں

سحر کی دید سے ہوتے ہیں روشن
شبِ دل کے ستارے مختلف ہیں

ابھی ٹھہراؤ کی بابت نہ پوچھو
ابھی یادوں کے دھارے مختلف ہیں

یہاں پر کیا کِھلیں گے رنگ میرے
یہاں منظر ہی سارے مختلف ہیں

وہ پیتل ہو کہ سونا ایک سا ہے
کہ سب نے رُوپ دھارے مختلف ہیں

پھول گرویدۂ موسم بھی ہوئے
اور بکھر جانے پہ برہم بھی ہوئے

دُشمنی لے لی ہوا سے میں نے
زخم شرمندۂ مرہم بھی ہوئے

کیا جڑیں پھیل سکیں گی ان میں
ریت کے ڈھیر اگر نم بھی ہوئے

تیرگی، نقشِ در و بام ترے
گاہے گاہے سہی مدھم بھی ہوئے

فخرِ افلاک جو ٹھہرے تھے وہی
خاک پر جادۂ ریشم بھی ہوئے

کیا مِلا درد کی گہرائی سے
بے نشاں تم بھی ہوئے ہم بھی ہوئے

تعلقات میں شکوہ مِرا اصول نہیں
خلوصِ دل کی مگر کج روی قبول نہیں

مِرے وجود میں ایسا بھی ایک صحرا ہے
اٹی ہوئی مِرے چہرے پہ جس کی دُھول نہیں

بساطِ وقت پہ پھر کیسے ریزہ ریزہ ہوا
مِرا قیاس تھا جو لمحہ میری بھُول نہیں

وہ ساتھ کیا کہ جسے صورتِ دوام ملے
وہ ہجر ہجر ہی کیسا کہ جس کو طُول نہیں

یہ برگ و بار کا سایہ گھنا سہی لیکن
شجر وہ پھر بھی اُدھورا ہے جس پہ پھُول نہیں

یہ بے حسی ہے کہ ہے انتہائے خوئے الم
نگر نگر ہے لہو اور کوئی ملول نہیں

فگار پاؤں لئے کس طرح یقین کروں
یہ راہِ سرو و سمن ہے یہاں ببول نہیں

ہو دل میں خلش آنکھ میں تھوڑی سی نمی ہو
اچھا ہو اگر راہ میں دیوار کھڑی ہو

ایسا نہ ہو پہنچیں تو وہاں بند ہوں دَر ہی
گھر جاتے ہوئے راستے پہ کائی جمی ہو

ایسی نہ کوئی بات ہواؤں میں ہو محصور
جو اُس نے کہی ہو بھی تو میں نے نہ سُنی ہو

پھر مجھ کو نظر آئے وہی بامِ فلک پر
اِک عُمر کی کاوش سے جو تصویر بنی ہو

کچھ رنگ مرے ہوں وہاں کچھ رنگ ترے ہوں
اور قوسِ قزح دونوں کے رنگوں سے سجی ہو

ساون کی جھڑی بن کے نہ آنکھوں سے برس جائے
جو بات ابھی خواب کے پردے میں چھپی ہو

کیا جانیے اِس شب کے کڑے وقت کو اب بھی
اِک چور دریچے سے سحر دیکھ رہی ہو

موت ہے موت کا سناٹا ہے
دل کی آواز پہ بھی پہرا ہے

ہم سمندر سے نمٹ آئے ہیں
زد پہ اب پیاس کے، اک صحرا ہے

ایک دریا بھی نہیں خشک جہاں
اُن زمینوں سے دُھواں اُٹھتا ہے

معجزے کی ہے توقع مجھ کو
میں نے پانی پہ قدم رکھا ہے

میں نے ملبے کو ہٹا کر دیکھا
ایک اک خواب مرا زندہ ہے

دُھوپ ٹھنڈی ہے ترے کوچے کی
نخلِ بے برگ کا بھی سایہ ہے

دھیان آیا اُسے میرا کیسے
جس نے اپنے ہی لئے سوچا ہے

بے یقینی کا دیا ہے کیسا
کبھی بجھتا ہے کبھی جلتا ہے

وہ کہاں ہے مجھے معلوم نہیں
ڈھونڈ لینا مرا مقسوم نہیں

اک وہی اُس کی سمجھ میں آیا
جو مری بات کا مفہوم نہیں

پھر بھی یہ منظرِ صبح ہے کیوں
شب چراغوں سے تو محروم نہیں

کیوں اسے لوگ کھنڈر کہتے ہیں
شہر مضمر سہی معدوم نہیں

نام زنجیر بکف ہے لیکن
لوحِ احساس پہ مرقوم نہیں

عدل ہے تابع حالات یہاں
کوئی مجرم کوئی معصوم نہیں

کیا تقاضا کیجئے اک خواہشِ بے نام کا
راستہ روکے ہوئے ہے قافلہ ابہام کا

پتھروں سے میری راہ و رسم ہی کمزور تھی
توڑنا چاہا تو تھا اک آئنہ الزام کا

رنگ صحرا کا بھی شامل ہو سکے اس میں تو ہے
صرف پھولوں کا ہی گہوارہ بھلا کس کام کا

راہ میں صحرا نوردی کے سبب کجلا گیا
ورنہ اُجلا تھا بہت چہرہ ترے پیغام کا

جذب کر لیں جس قدر بھی روشنی باقی ہے اب
پھیلنے کو ہے دُھندلکا زندگی کی شام کا
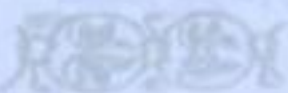
وہ دیا کیا دیا ہے جو جلتا نہیں
راستے کا قرینہ بدلتا نہیں

اتنی سفاک دل کی زمیں ہے کہ اب
بیج ہی خواب کا کوئی پھلتا نہیں

برف باری میں نشوونما کیا ہوئی
میرا لہجہ تپش سے پگھلتا نہیں

جس کا احساس طوفِ تجارت میں ہے
وہ عقیدت کے سانچے میں ڈھلتا نہیں

کہہ دو سارے چراغوں سے جلتے رہیں
رات کے وقت سورج نکلتا نہیں
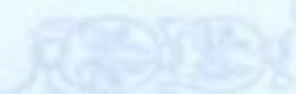
جو جفا کے مرتکب ٹھہرے وفا کے بعد بھی
ابتدائی گام پر ہیں انتہا کے بعد بھی

اِس علاقے کی حدیں ہیں دُور تک پھیلی ہوئی
ہم سزا کے پیچ و خم میں ہیں سزا کے بعد بھی

دینے والا ہی طلب کی انتہا سمجھے تو ہے
ہم تو شرمندہ سے رہتے ہیں دُعا کے بعد بھی

کیا یہی خورشید ہوگا اور یہی آثارِ دشت
کیا اِسی رستے سے گزریں گے فنا کے بعد بھی

رنگ پھیکا نظر آنے لگا آرائش کا
آئنہ ٹوٹ گیا ہوگا مری خواہش کا

اِس علاقے میں گراں صورتِ سیرابی ہے
دیکھنے آئے ہو تم رقص جہاں بارش کا

دُوری و قرب کی منزل کا پتہ کیا دیتے
جو سلیقہ ہی نہیں جانتے پیمائش کا

کیا توقع کی حدیں پھیل رہی ہیں دل میں
سلسلہ ختم ہوا جاتا ہے فہمائش کا

میں بھی اب گننے لگی راہ کے پتھر کانٹے
اُس نے بھی ذکر کیا ہے کسی آسائش کا

یہ کیسا اَوج اس کی لہر میں ہے
سمندر کا قرینہ نہر میں ہے

یہ بینائی ہے میرے دل کے اندر
نظارا تو تمہارے شہر میں ہے

نیا امرت ہے پھیکا اور کڑوا
حلاوت تو پرانے زہر میں ہے

دلوں میں بھی یہی اب جذب ہو گی
نمی سی جو فضائے دہر میں ہے

ارادہ کیا جو رستہ بھول جائے
خیال و خواب ہی میں گھر بنائے

وہ ثابت کر رہا ہے جُرم اپنا
نظر ملتے ہی جو چہرہ چھپائے

حصارِ تشنگی میں آ گئے کیوں
چلے تھے ہاتھ میں دریا اُٹھائے

وہیں سے راستہ بدلا تھا میں نے
گھنیرے تھے جہاں پیڑوں کے سائے

کسی سے موت بھی منہ موڑ بیٹھے
کسی کو زندگی بھی راس آئے

ہمارا ہر ارادہ بے ثمر تھا
بصارت کی زمیں سے بے خبر تھا

تھا میری فکر کا شیشہ سلامت
بہت حیران اک آئینہ گر تھا

وہ کیسا شہر تھا خوابِ رسا کا
گراں مایہ جہاں نقشِ ہُنر تھا

چٹخ جاتی تھی زنجیرِ اَنا بھی
کسی کے ذکر میں کیسا اثر تھا

وفا کے قحط سے آنکھیں گڑی تھیں
طلائی طشت پر اُڑتا نگر تھا

بَری تھا منزلوں کی جستجو سے
جو دشتِ ذات کا اندھا سفر تھا

راہِ صحرائی پہ خوشبو کا سفر یاد آیا
سرخ پھولوں سے بنایا ہوا گھر یاد آیا

یاد آسیب کی صورت مِرے ہمراہ رہی
اِک نگر پہنچے تو ایک اور نگر یاد آیا

شب کے افسردہ اندھیرے کو کسی لمحے میں
یاد آیا بھی تو اندوہِ سحر یاد آیا

دستِ احساس نے ملبے کی کہانی لکھی
کوئی دیوار ہی یاد آئی نہ دَر یاد آیا

حاصلِ زیست ہو خلوت مگر اتنی بھی نہیں
خود سے کی جائے محبت مگر اتنی بھی نہیں

رزمِ احساس سے مہرہ ہی ہٹا دوں اُس کا
ہے مجھے اُس سے شکایت مگر اتنی بھی نہیں

اک دیا بھی وہ مِرے نام پہ روشن نہ کرے
ہے اُسے رات سے نسبت مگر اتنی بھی نہیں

کیا ہُوا خشک ہوئے جاتے ہیں دریا سارے
ہے مِری فصل کی قیمت مگر اتنی بھی نہیں

جزوِ زندگی ٹھہرا اب گمان میں رہنا
بے ثمر ارادے کے امتحان میں رہنا

بُجھ کے بھی ہویدا ہو جو دیارِ ہستی میں
اُس چراغ کی صورت میرے دھیان میں رہنا

منظرِ حقیقت کو پہلے روشنی دینا
پھر سراب ہو جانا داستان میں رہنا

بے کنار دریا میں ناؤ ڈال دی تو پھر
اعتبار کی صورت بادبان میں رہنا

میں خلا کا حصہ ہُوں اور مرا مقدر ہے
چاند اور ستاروں کے درمیان میں رہنا

راستے کی سمت اکثر دیکھتے رہتے ہیں کیوں
خاک اپنے فیصلوں کی چھانتے رہتے ہیں کیوں

کیوں جَلا رکھتے ہیں ہم اپنے تجسّس کا دیا
جس کو پا لیتے ہیں اُس کو ڈھونڈتے رہتے ہیں کیوں

ہم مہک کے استعارے کو بدلتے کیوں نہیں
تحفۂ خوشبو گلوں سے مانگتے رہتے ہیں کیوں

تجربہ ہم توڑنے کا کیوں اُسے کرتے نہیں
رنجشوں کے دائرے میں گھومتے رہتے ہیں کیوں

لوحِ ناہموار پر حرفِ وفا تو لکھ دیا
اُس کی بابت اِس قدر اب سوچتے رہتے ہیں کیوں

کیسے کھلے گا پھر سے مرا شوقِ بے نمو
سُورج ہے اور نہ لمحۂ باراں ہے رُوبرو

بے داغ آئینے کی طرح صاف ہے مگر
بے عکس ہو گئی ہے مری چشمِ آرزُو

چُنتا نہیں ہے کوئی مگر دیکھتا تو ہے
موتی بکھیرتا ہے جہاں آنکھ کا لہو

صحرائے بے خودی میں سرِ راہِ انتظار
اپنی ہی چاپ سے ہے کوئی محوِ گفتگو

گل ایک ہے اور اسکے نگہدار ہیں کئی
کرنا پڑے نہ دیکھئے تقسیمِ رنگ و بو
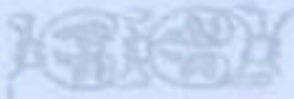
آسیب کا اثر تو نئے شہر پر بھی ہے
بے کیف ہے اُداس ہے احوالِ کاخ و کو

کیوں لڑکھڑا رہی ہے کرن ماہتاب کی
کیا صد چراغ رات کا چہرہ ہے دُو بدو

رقصِ تمنا جاری ہے
دُکھ کا پلّہ بھاری ہے

پس منظر اِس قصے کا
خواب نہیں بیداری ہے

سُورج رتھ پر بیٹھے ہو
گہرا نشّہ طاری ہے

دن کے رہرَو نے اکثر
مشکل رات گزاری ہے

پانی کیوں صحرا کو دُوں
پیاسی تو پھلواری ہے

دُنیا سے کیوں ڈرتے ہو
دُنیا تو بےچاری ہے

میں نے سب کچھ جھیل لیا
اب اوروں کی باری ہے

موت کا انتظار کرنا ہے
زندگی سے بھی پیار کرنا ہے

اب سحر سے مقابلے کے لئے
سب دیوں کو شمار کرنا ہے

عرصۂ ہجر کاٹنے کے لئے
وقت پر انحصار کرنا ہے

خانہ جنگی ہے اپنی وحشت سے
اپنے گھر کا حصار کرنا ہے

چُننے کو راستے کے سب پتھر
اک سفر بار بار کرنا ہے

دل کو رکھنا ہے اِس کنارے پر
اور دریا بھی پار کرنا ہے

کوئی فصیلِ رنج میں اِک در بنا سکے
بے راہ رَو خیال کو رستہ دِکھا سکے

دل اس قدر نہ زخمِ عداوت سے ہو نڈھال
رنجش کے دائرے میں دیا تو جلا سکے

میری شکستہ ضرب کو شرمندگی ہوئی
بے چشم پتھروں پہ کہاں زخم آ سکے

کچھ اس طرح گمان و یقیں کی حدیں ملیں
ہم پاس ہی رہے نہ کبھی دُور جا سکے

سبزہ تو ابرِ دل کی نمی کا ہے معجزہ
کوئی تو ریگِ دشتِ طلب کو بتا سکے

احساس کی تپش سے سُلگتے چراغ کو
کب بادِ احتیاط کے جھونکے بجھا سکے
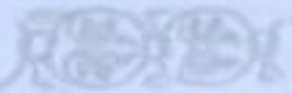
قفس کے بے زباں لمحوں کی ہر تصویر لے جانا
جو کھل جائے تو اپنے ساتھ یہ زنجیر لے جانا

تمہارے شہر میں گر ذوقِ بینائی سلامت ہے
تو اپنے ساتھ میرے خواب کی تعبیر لے جانا

صِلہ دینا شکستِ ہمرہی کو بے گناہی کا
جو اس کے ذکر سے زندہ ہے وہ تشہیر لے جانا
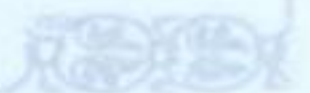
ارادہ راکھ ہوتا جا رہا ہے
سیاہی میں سموتا جا رہا ہے

وہ کب ٹوٹا ہے شاخِ زندگی سے
جو پتّہ زرد ہوتا جا رہا ہے

حبابِ زندگی سے کون پوچھے
یہ کس کس کو ڈبوتا جا رہا ہے

منقّش تھا وجودِ سنگ پر جو
وہ رزقِ آب ہوتا جا رہا ہے

سمندر ڈھونڈتا دریا کا پانی
زمیں پر حُسن بوتا جا رہا ہے

ہے تارِ ضبط جو گرنے سے پہلے
مرے آنسو پروتا جا رہا ہے

کیا ہے خود ہی اگر فیصلہ جُدائی کا
کوئی جواز نہیں بخت آزمائی کا

دِکھاؤں راہ میں اذنِ سفر اُسی سے ملے
وہ چاہتا ہے یہ انداز رہنمائی کا

کس انتظام سے موسم کا ساتھ دیتے ہیں
گُلوں کا پیڑ سے رشتہ ہے بے وفائی کا

تجھے میں اپنا تو جانوں مگر گِلہ نہ کروں
یہ التزام عجب ہے تری خدائی کا

بے کراں نور سے بھر کے رہِ صحرائی کو
شب کی دیوار میں چنوا دیا بینائی کو

لبِ ساحل مری کشتی کو ڈبو کر دریا
ایک مفہوم نیا دے گیا گہرائی کو

بے تامّل تری مٹھی میں رہوں گی میں بھی
اور حیران کروں گی تری گیرائی کو

متنِ سادہ کی صداقت نے گواہی دی تھی
اِس لئے فیض ملا حاشیہ آرائی کو

پھُول کاغذ کا سہی اپنی علامت بھیجو
کچھ تو آسان کرو بادیہ پیمائی کو

سیہ مہتاب کی وہ چاندنی تھی
قلم کے نقش سے جو پھیلتی تھی

خزاں کا رزقِ برگ اور پھول ٹھہرے
وگرنہ شاخ تو جب بھی ہری تھی

اندھیرے میں یہ تنہا سوچنا ہے
کہ تم بھی ساتھ تھے جب روشنی تھی

سبھی کچھ تھا سوائے اک دیے کے
مگر ہر چیز کو میں ڈھونڈتی تھی

کوئی بھی حرف بے معنی نہیں تھا
کتابِ دل کبھی ایسے کھلی تھی

کھٹکتی ہے مجھے وہ دُوسروں میں
تمہاری بات جو اچھّی لگی تھی

سحر تک جھٹپٹے کا فاصلہ تھا
جہاں دیوارِ شب اُس نے چُنی تھی
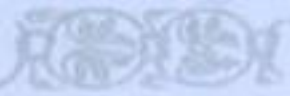
قیامت کی گھڑی کا عکس دیکھوں
زمیں اور آسماں ہم رقص دیکھوں

ہیں اُس کے ساحلوں سے دُور کتنے
یہ اپنے ساحلوں میں نقص دیکھوں

درِ تخلیق ہی کو کھٹکھٹاؤں
میں اُس جیسا کوئی تو شخص دیکھوں

گزرتی زندگی کے آئنے میں
چنیدہ دائروں کا عکس دیکھوں

دیا رکھ دوں اگر لہروں کے اُوپر
تو بہتی روشنی کا رقص دیکھوں

سمندر کی طرح ہے ذائقے میں
فضا میں پھیلتا جو حبس دیکھوں

بے سمتی نے ایک جزیرہ ڈھونڈ لیا ہے
دل نے شہرِ ذات کا رستہ ڈھونڈ لیا ہے

اپنی کھوج میں برسوں سے میں بھٹک رہی تھی
میں نے اب صحرا میں سونا ڈھونڈ لیا ہے

اپنی پیاس کی گہرائی کا بھید سمجھ کر
اپنی ہی آنکھوں میں دریا ڈھونڈ لیا ہے

دونوں وقت جہاں ملتے ہیں اُس ساعت میں
زندگی میں نے ترا کنایہ ڈھونڈ لیا ہے

چھاؤں بنانے چھاؤں اُٹھانے والے مولیٰ
میں نے تیرے اِسم کا سایہ ڈھونڈ لیا ہے

کشمکش

گئے سمے وہ اور تھا
اور اِس سمے کچھ اور ہے
کبھی ہنسی کی روشنی
کبھی مہیب رات کا سا منفعل ملال ہے
بلندیوں کا، پستیوں کا
اک عجیب جال ہے
بدلتے رنگ اُسکے میری بے بسی کا عکس ہیں
مری فگار کاوشوں کا نقش ہیں
اور اُسکے پا شکستہ اعتماد کی کلید بھی

عجیب بات ہے

تمام چاہتیں صلہ ہی چاہتی ہیں کیوں
یہ انتظار، اعتبار کیوں نہیں
جو راستہ خود اپنے واسطے چُنا
اُسی پہ ہم کو اختیار کیوں نہیں

Repentance

بہت شور ہے
خانۂ دل میں
لشکر اُبھرتا ہے
چھینٹے اُڑاتا ہوا
گرم گاڑھے لہو کے
گذر جاتا ہے
اس کی یورش میں
پہچانے ، انجانے چہرے
اُڈتے ہیں، کٹتے ہیں
گرتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں
کھو جاتے ہیں،
اور پھر

مضمحل، گہری بے بس خموشی میں
بکھرے ہوئے سرد لاشوں پہ
آنسو بہاتا ہوا
قافلہ جو ٹھہر جاتا ہے
اس کی منزل کہاں ہے؟

کیوں

کیا مِرا جسم نہیں ہے کوئی
یا مِری رُوح کی خاموشی سے
اتنا خائف ہے کہ شَل رہتا ہے
کیوں مِری آنکھ کی پُتلی سے
دہکتے ہوئے منظر بھی گزرتے ہیں
تو کچھ سرد سے پڑ جاتے ہیں
کیوں مِری بات
مِرے لہجے کی نرمی سے گریزاں ہو کر
اپنا مفہوم بدل لیتی ہے
کیوں یہ تقصیر بھی میری ہے
کہ یہ رُوح، یہ بینائی، یہ الفاظ
مِرے بس میں نہیں!
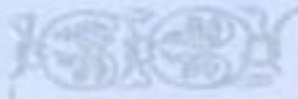
Ambition

دشت در دشت اُداسی کا سفر جاری ہے
رخشِ اُمید پہ ہر لمحہ بہت بھاری ہے
سرخوشی بازُوؤں کو پھیلائے
آج بھی میرے تعاقب میں ہے اور میں
تیشۂ صدق لئے
قالبِ مشتاق لئے
غیرممکن کی طلب میں کوشاں
اُس کے احصار سے کترا کے گزرنا چاہوں
راہِ ناپید پہ چلنا چاہوں!

وہ لمحہ کیسا ہوتا ہے؟

جو بار آور نہیں ہوتا
وہ لمحہ کیسا ہوتا ہے
جو رنگ و خوشبوؤں کے آبگینے توڑ دیتا ہے
جو یادوں کی کھلی آنکھوں کو
اپنے سرد ہاتھوں کے اثر سے موند دیتا ہے
جو دن کی روشنی میں شب کی آمیزش سے
ایسی ساعتیں تخلیق کرتا ہے
جو آسودہ ہی ہوتی ہیں نہ افسردہ ہی ہوتی ہیں
کبھی ہنستی کبھی بے طرح روتی ہیں
جو رستہ کھوجتی اور منزلوں کو بھول جاتی ہیں
جو زندہ ہیں نہ مرتی ہیں

جوڑ رتی ہیں ادائے وِقت سے،
رُکتی نہ چلتی ہیں
فصیلِ بے یقینی پر رکھی
شمعوں کی صورت
آس میں بجھتی نہ جلتی ہیں
جو ایسی ساعتیں تخلیق کرتا ہے
وہ لمحہ کیسا ہوتا ہے

کشف

میں اپنی کھوج میں گم تھی
کہ میں کیا ہُوں
ازل کے حادثے کا سلسلہ ہُوں
یا فقط مٹی کی مُورت ہوں
مسخر کرنے والا ذہن ہُوں
احساس کی دھیمی سجل آواز ہُوں
یا اپنے خالق کی
کوئی ایسی ادا ہوں
جو اُسے خود بھا گئی ہے---
تمھیں پایا تو یہ جانا
کہ میرا بھی کوئی مفہوم ہوگا

تمہیں کھو کر

مرے مفہوم کی صورت نکھر آئی

فشارِ بے یقینی نے

وفا کے بند گنبد میں

ازل کے کرب کی صورت میں

اپنی ابتدا دیکھی

ابد کے آئینے میں

انتہا کا نقش بھی دیکھا

خُدا کا عکس بھی دیکھا!

ناگزیر

کسی ہموار سطحِ نرم پر بھی
پاؤں زخمی ہوں
تو چلنے میں بہت تکلیف ہوتی ہے
کسی نامہرباں
پتھریلے خطے میں
اگر تلوے سلامت ہوں
تو نوکِ خار سے
سنگِ تپاں سے
نور کے چشمے اُبلتے ہیں
طوالت مختصر لگتی ہے
لمحے اُڑنے لگتے ہیں

سفر کے ختم ہونے پر
مگر پھر بھی
برہنہ پاؤں میں
چھالے اُبھرتے ہیں!

تخلیق

اک طرف اُجالا ہے
اک طرف سیاہی ہے
دونوں میرے ہمجولی
ہم رکاب ہیں میرے
زیست گر اُجالا ہو
حرف جلنے لگتے ہیں
اور اگر سیاہی ہو
بے چراغ لگتے ہیں
دونوں کے تصرّف سے
زندگی اُبھرتی ہے
جھٹپٹے کی ساعت میں
حرفِ دل کے خالق کی
بے کلی چٹکتی ہے!

عُقدہ

میرے اور تمہارے بیچ اک سایہ ہے
جو گھٹتا بڑھتا رہتا ہے
میری اور تمہاری حد پر
اک اُونچی دیوار بھی ہے
جو گاہے گاہے شق ہوتی ہے
اور پھر سے بن جاتی ہے
میرے اور تمہارے بیچ اک ساگر ہے
اک گہرا ساگر
طوفانی موجوں سے بوجھل
ساحل جس کے آدھے دلدل

جن کی سرحد آنکھ سے اوجھل
میرے اور تمہارے بیچ اک رشتہ ہے
جو سچا ہے!

تشخیص

ایک سا تجربہ
ایک ہی دُکھ ہمارا ہے
میں نے تمہارا نوشتہ جو دیکھا تو جانا ہے
لیکن مِرے حرف سب مختلف ہیں
یہ اک سرد آسیب اوڑھے ہوئے ہیں
یہ گرتے ہوئے آنسوؤں کو
ہتھیلی میں اپنی سمیٹے ہوئے
قند کا ذائقہ دے رہے ہیں
یہ شاید
کسی دُکھ کو سہنے کی کوشش میں
ہنسنے لگے ہیں!
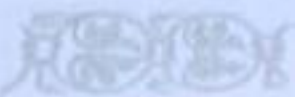
نئے سوالوں کی بات کیجے

اپریل ۱۹۸۹ء

گئی رُتوں کی کہانیاں ہیں
نشانیاں ہیں
وہی کھنڈر ہے
وہی تماشائے عہدِ رفتہ

یہ خم نیا ہے
عَلم نیا ہے
نئے سوالوں کی بات کیجے
جواب دیجے
کہ آنے والے سمے کا آئینہ
آپ کو بھی
اِسی طرح منعکس کرے گا!
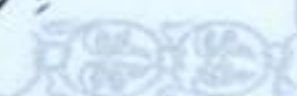
یہ عہدِ نو ہے

اپریل ۱۹۸۹ء

سنا ہے ہم نے
یہ عہدِ نو ہے
فگار ہاتھوں میں مشعلیں ہیں
اُداس آنکھوں میں روشنی ہے
نئی اُمنگوں کی
ولولوں کی
محبتوں کی،
نجیب لمحوں پہ
نخوتوں کا گماں نہیں ہے
یہ عہد و پیماں
نئے نئے ہیں

صبح لفظوں کی سب قطاریں کھلی ہوئی ہیں

نئے روابط

نئے صلوں کا یقین لے کر

کھلی فضاؤں میں رقص گر ہیں

مگر لہو کی یہ سرد بارش!

حساب اس کا بھی دے گا کوئی؟

کہ اس کو عہدِ گذشتگاں کے سپرد کر کے

نئی رُتوں کے جمیل رہبر

نئی سبیلوں پہ

رقص کرتے رہیں گے یونہی

سماعتوں پہ

بصارتوں پہ

فریب بُنتے رہیں گے یونہی!

جذبۂ شوق کا مینار اگر

جذبۂ شوق کا مینار اگر
رشتۂ درد کا شہکار اگر
خوبصورت ہے
مکمل ہے
تصور سے حسیں تر ہے تو پھر
آنکھ جو دیکھ رہی ہے اس کو
اُس کی تحریر کے آئینے میں
کیوں تحیر کی علامات نہیں
کیوں تخیل کے دریچے سے اُسے
اپنے احساس کی وسعت میں اُبھرتا ہوا اک تاج محل
اِس عمارت سے بہر طور جُدا لگتا ہے
طرزِ تعمیر میں کچھ اِس سے سوا لگتا ہے!

صِرف

وہ جو میری گرفت ہی میں نہ تھا
ایسے لمحے کو کیا تلاش کروں
وہ جسے بامِ بے یقینی سے
میں نے چھُپ کر کبھی کبھی دیکھا
ایسی اُلجھن پہ کس کا نام لکھوں
وہ جسے درد کے سمندر میں
آشنائے سفر نہیں دیکھا
اُس کو کن ساحلوں کا ربط کہوں
جس نے مجھ کو جُدا کیا مجھ سے
جس نے پورا اصلہ لیا مجھ سے
لوحِ ہستی پہ بے نشاں ہے وہ
صِرف اندیشہ و گماں ہے وہ!

1990ء

ہر نئے سال کی صورت یہ بھی
ویسی ہی صبح لئے
عرصۂ زیست پہ ہوتا ہے طلوع
وہی محور
وہی افلاک و زمیں کی گردش
وہی خوں رنگ لکیروں کے بدلتے نقشے
وہی لمحے
وہی خاموش گزرگاہ
جہاں سے کبھی راہی کوئی
یوں گزرتا ہے کہ گویا اُس کو
پھر کبھی لَوٹ کے آنا ہی نہیں اِس جانب

وہی موسم، وہی منظر، وہی آنکھیں جن سے
چند لمحوں کے لئے
سالہا سال سے رکھے ہوئے حالات کے بے جان بتوں کو
چھُو کر
اک روایت کو ترو تازہ کیا جاتا ہے
پھر انہی لمحوں کی بے سُود تھکن سے بوجھل
آنکھ کو موند لیا جاتا ہے
بانجھ ہے دیدۂ بے خواب مگر
اک برس اور دیا جاتا ہے
نخلِ اُمید کے پھلنے کے لئے
منظرِ زیست بدلنے کے لئے!

روشنیوں کا شہر..... کراچی

۱۰ر فروری ۱۹۹۰ء

روشنیوں کے شہر کی راہ گزر اُداس ہے
روئے ہوئے ہیں بام و دَر سارا نگر اُداس ہے

سائے ہی سائے ہر طرف، صَرفِ لہو سے تر بتر
وقت کا حاشیہ سیہ رنگِ سحر اُداس ہے

راکھ ہوا ہے آشیاں لَوٹ کے آئے گا کہاں
اپنے پرند کے لئے شاخِ شجر اُداس ہے

کس کو دُھواں کیا کس کے مٹا دیئے نقوش
اپنی صفت پہ شرمسار رقصِ شرر اُداس ہے

جیسے یہ دیکھتا ہو سب ، جیسے یہ جانتا ہو سب
جیسے شریکِ درد ہو میرا بھی گھر اُداس ہے

حرفِ یقیں سے بدگماں، کس کا ہے آج نوحہ خواں
کیسے لکھے یہ داستاں دستِ ہُنر اُداس ہے

سوال

جو لمحۂ ثبات تھا گزر گیا
وہ لمحۂ ثبات تھا کہ خواب تھا
جُدائی کے طویل راستے کا سنگِ میل تھا
کہ وقت کے گھناؤنے مذاق کی دلیل تھا

اُداس ساحلوں پہ جیسے ریت
چڑھتی موج سے کبھی جو بھیگ بھی گئی
تو کیا حقیقتیں بدل گئیں
ثبات ساعتیں ٹھہر گئیں؟

سوال تو یہ ہے

ثبات اگر کسی وجود کو نہیں
تو پھر فنا کی سمت جانے والے راستے
مدام کس لئے ؟

تقدّم

حقیقت خواب اوڑھے سو رہی ہے
تہہِ سطحِ زمیں کیا کچھ نہیں ہے
اسی آسودہ احصارِ خبر میں
بہت کچھ بے خبر سمٹا ہوا ہے
کہیں کمزور ذرّہ ہو کہ لمحہ
بکھر کر ہی رہے گا سمِ باطن
یہ افسوں ٹوٹ کر تازہ کرے گا
سراب و خواب کا وقتی فسانہ
حقیقت کا مقدم تازیانہ!

Depression

عکس کو روشن کرنے والا ہر آئینہ ٹوٹ گیا ہے
کرچی کرچی
پیکرِ جاں کی ایک اک رگ کو کاٹ رہی ہے
اور لہو سے
حرفوں کے کچھ مدھم سے آثار بنے ہیں
بامعنی اور بے معنی اندیشوں کے انبار لگے ہیں
بنتے بگڑتے حرفوں کے سنگم سے اک آواز اُبھری ہے
بند فضا میں
دیواروں سے سر ٹکرا کر
یہ آواز بھی لَوٹ آئی ہے

گونج دریدہ جسم پہ ایسے ٹھہر گئی ہے
جیسے قبر کی تاریکی میں
مردہ جسم پہ جمنے والی گیلی مٹی
مٹی کی ہر قبر پہ لیکن
کتبہ تو سچا ہوتا ہے!

یاد

مدتیں بیت گئی ہوں جیسے
تلخیاں بھُول رہی ہوں جیسے
ہلکی ہلکی سی کسی سمت سے خوشبو آ کر
نارسائی کی گھنی دُھند میں ضم ہو جائے
دُھند مہکے ہوئے پانی کی طرح
خوشبو و رنگ لئے
مرقدِ رنج کی مٹی کو بھگوتی جائے
سُوکھے پتوں میں سموتی جائے!

لَو اُبھرنے تک

منحرف ہے یقین کی منزل
اک تذبذب سے اک تذبذب تک
ہے مسلسل تلاش کی صورت
سنگ کو آئنہ بنانے میں
روشنی سے تراش کی صورت

ہر اُفق سنگِ میل ہو جیسے
سفرِ ناتمام جاری ہے
حرفِ امکاں کی لَو اُبھرنے تک
زندگی سے کلام جاری ہے

پسِ آئینہ

(۱۹۸۸)

انتساب

ہمیشہ مجھ پہ اُسی کی دُعا کا رنگ کھِلا
وہ جس کی چھاؤں مری زندگی کا رخت ہوئی

اپنی امی کے لیے
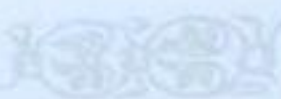
عکسِ حیرت کو خد و خالِ بقا دیتا ہے
ایک سایہ جو لرزتا ہے پسِ آئینہ

فہرست

کسی انداز سے دینا، شفائے بال و پر دینا
سکوتِ عرصۂ جاں کو نویدِ رہگزر دینا

کہیں آغوش میں سورج کہیں ہوں چاند کی کرنیں
مری مٹی کو یہ سرمایۂ شام و سحر دینا

کٹھن رستہ سہی، تکمیل کا چہرہ دکھا دینا
سمندر زندگی کو ساحلِ رنجِ سفر دینا

دلِ آتش نما بھڑکے تو بینائی چمک اُٹھے
جلانے کی بجائے روشنی دے، وہ شرر دینا

کبھی مظلوم کے ہاتھوں میں ظالم کی سپر دے کر
ضمیروں کی کجی کو اپنے ہونے کی خبر دینا

ترے فنکار کی اپنے لئے بس عرض ہے اتنی
خوشی سے رنج و غم دینا مگر تابِ ہنر دینا
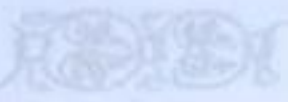
مِرے چراغ، تُو میرے لئے نہ ہو محدود
خُدا کرے میں تری روشنی کو بانٹ سکوں

کنارے پر کھڑی ہوں اور کنارے ڈھونڈتی ہوں
سحر کی روشنی میں چاند تارے ڈھونڈتی ہوں

لہو کی روشنائی سے جنہیں لکھا گیا ہو
میں طاقِ عُمر میں ایسے شمارے ڈھونڈتی ہوں

وہ جن کو میرا بچپن سوچتا اور چاہتا تھا
کسی کی ذات میں وہ رنگ سارے ڈھونڈتی ہوں

مسافت کی تھکن، تسکین و یکسوئی کا سایہ
میں تکمیلِ سفر کے استعارے ڈھونڈتی ہوں

کھڑی میں آخری سیڑھی پہ اُوپر دیکھتی ہوں
فلک کی آنکھ میں تازہ اشارے ڈھونڈتی ہوں

مجھے ہر منجمد شے موت کا پرتو لگی ہے
میں تصویروں میں بھی زندہ نظارے ڈھونڈتی ہوں

تیز رَو پانی پہ بہنے کا ارادہ اور میں
بند باندھے رہ نہ جائیں جوشِ دریا اور میں

اک سمندر اِس طرف ہے، اک سمندر اُس طرف
بیچ میں خشکی کا ناہموار رستہ اور میں

آئنہ ٹوٹا ہوا ہے عکس ہے بکھرا ہوا
کرچیوں پر خون کے دھبّوں کا نقشہ اور میں

رقص گاہِ زندگی میں ناچتے ہیں ساتھ ساتھ
وحشتِ حالات کا بدمست چہرہ اور میں

ایک جلتے کھیت کو آباد کرتے کس طرح
آنکھ سے بہتا ہوا پانی کا چشمہ اور میں

ایک لاحاصل سفر پر چل رہے ہیں ساتھ ساتھ
اک کسی کے نام کا بے ربط رشتہ اور میں

لاپتہ ہیں ایک گم گشتہ جزیرے پر ابھی
اک مسافر میرے اندازے سے گہرا اور میں

اختیار میں اپنے وقت کا اشارا ہو
ایک ہاتھ میں رستہ، ایک میں ستارا ہو

بے نصاب لمحوں کو اس طرح سنوارا ہو
ایک پَل پہ نام اُس کا، ایک پَل ہمارا ہو

یوں نہ ہو کہ آوازیں راستے میں کھو جائیں
اُس سمے جواب آئے جس سمے پُکارا ہو

شب نما حقیقت پر دھوپ سی ٹھہر جائے
عکس اُس کے پیکر کا اِس طرح اُتارا ہو

اِذن کے توسط سے خوبیاں عیاں ہوں گی
کوئلے کے قالب سے جس طرح شرارا ہو

اک فریب ہو ایسا جو نہ کھا سکے کوئی
دُور سے بھنور جیسا، پاس سے کنارا ہو

چاند کس سوچ میں ہے بحر کا پانی بولے
مجھ پہ مرکوز ہے اشکوں کی روانی بولے

اک نیا خاکہ، لکیروں کا سیہ نقطوں کا
بیچ میں رنگ نما بات پرانی بولے

مہرباں تم پہ ہے مٹی بھی یہاں سورج بھی
سبز پتوں سے یہ موسم کی گرانی بولے

کیوں اندھیرا ہی ٹھکانہ تھا مِری خوشبو کا
دن چڑھے سہمی ہوئی رات کی رانی بولے

کس کی وحشت نے مجھے جامۂ تحریر دیا
اپنی تخلیق پہ شرمندہ کہانی بولے

ایک ہی بوند ہوں، سیپی میں چھپا لو مجھ کو
ورنہ اُڑ جاؤں گی، بارش کی نشانی بولے

وہ بدل کر کبھی انداز پذیرائی کا
امتحاں لے مرے احساس کی بینائی کا

آئی جب اُس کے مقابل تو نیا بھید کھُلا
مجھ کو اندازہ نہ تھا اپنی توانائی کا

اُس نے بس سطح پہ چلنے کا سلیقہ سیکھا
اور سمجھنا تو مجھے، کام تھا گہرائی کا

بھیڑ کے شور میں آواز نہ گم ہو جائے
اس لئے ذکر نہیں کرتے ہیں تنہائی کا

رُوح کی کوکھ ہمیشہ ہی تہی رہتی ہے
غازہ چہروں پہ سجا رہتا ہے زیبائی کا

وقت نے کوئی گرہ کھولی نہیں ہے اب تک
بس لئے پھرتا ہے اک زعم مسیحائی کا

کھو گیا کثرتِ گویائی کے ہنگامے میں
ایک جو حرف تھا گفتار میں دانائی کا

اب کھلے رکھیے مناجاتوں کے دَر
حرف سے ٹپکایئے خونِ جگر

جب دیارِ ذات میں کچھ بھی نہیں
کیا ہوا جو گر گئے دیوار و در

یہ نہیں لازم کہ منزل ہو وہاں
ختم ہو جب بھی کہیں کوئی سفر

دیکھئے چٹخیں گے انگارے بہت
کیوں دیئے پانی کی چھینٹے آگ پر

کیوں تھکن کا عکس بن کر رہ گیا
کیوں نہیں مٹتا نشانِ رہگزر

کون چھو کر انتہا کو آئے گا
کس پہ ہو گا انکشافِ بال و پر

بس اچانک ہی اندھیرا ہو گیا
جس طرح یک لخت چمکی تھی سحر

کس لئے خاکہ ادھورا رہ گیا
یہ نہ بتلائے گا کوئی نقش گر

بیٹھے بیٹھے دفعتاً اس کا خیال آنے لگا
سوچ کی بے سمت پروازوں پہ جال آنے لگا

وقت کی دیوار پر اُبھرے ہیں پھر اس کے نقوش
یاد مجھ کو وہ نگارِ ماہ و سال آنے لگا

کس طرح برسوں ہوا کے ہاتھ پر بیٹھی رہی
ذہن میں پھر سے وہی اندھا سوال آنے لگا

رُوح کی تکسیر سے پیوند جیسے کھُل گئے
جرأتِ اظہار کا مجھ میں کمال آنے لگا

ایک چنگاری ہی ذکرِ ناروا کی تھی بہت
برف جیسے سرد پانی میں اُبال آنے لگا

جو محرک تھے مری تعمیر کے وہ کیا ہوئے
کیوں ترے اعجاز پر دورِ زوال آنے لگا

خوبیوں کے جتنے بھی تھے استعارے چھپ گئے
جب سے بزمِ شوق میں وہ بے مثال آنے لگا

گزر گئی شب گزر گیا دن بشارتوں کا
رکھا ہوا ہے حساب میں نے بھی ساعتوں کا

جو گل بکف لمحے شاخِ ہستی پہ بوجھ ٹھہرے
چکایا جائے گا قرض ان کی عنایتوں کا

یہ حرف کیا ہیں یہ لَے ہے کیسی یہ راگ کیسا
بدل گیا گیت تیری میری سماعتوں کا

وجود سے آ سکے جو باہر تو کتنا پھیلے!
طویل تر سلسلہ ہے اندر شکایتوں کا

مرا جزیرہ نئی زمینوں سے کٹ گیا ہے
پرانا ہے متن دل کی تازہ عبارتوں کا

یہ قتل گاہیں جو گر رہی ہیں تو شور کیسا
یہ کس لئے ہو رہا ماتم روایتوں کا

میں ہر گزری ہوئی ساعت سے ہر پل سے نکل جاؤں
اگر وسعت کی پروردہ ہوں جنگل سے نکل جاؤں

میں بجلی ہوں، شرارہ ہوں اگر بادل کے اندر ہوں
اور اک رحمت کا قطرہ ہوں جو بادل سے نکل جاؤں

رکھوں میں وقت کے مہرے کو اس انداز سے اب کے
حدودِ زندگی کے آج اور کل سے نکل جاؤں

نہ میں نے تیرنا سیکھا نہ خشکی پر سفر کرنا
مگر یہ سیکھ لوں گی پہلے دلدل سے نکل جاؤں

ایک بحرِ سرد جیسے ساحلوں کے درمیاں
درد کا پھیلاؤ ہو گا فاصلوں کے درمیاں

شام ہونے سے ذرا پہلے لیا تھا راستہ
اور اک شب پڑ گئی ہے منزلوں کے درمیاں

رابطہ اپنی جگہ تھا، فاصلہ اپنی جگہ
تھی سبیلِ ضبط محکم، قافلوں کے درمیاں

آج کا انسان بھی تسخیر کر سکتا نہیں
جو خلائیں ٹھہر جاتی ہیں دلوں کے درمیاں

تلخیوں کا زہر پینے کی تو عادت ہے مگر
تھوڑا وقفہ دیجیے اِن سلسلوں کے درمیاں

یوں خوشی بانٹی کہ دونوں ہاتھ خالی ہو گئے
کھو گیا پھر دینے والا سائلوں کے درمیاں

ہر گواہی پر وہی تعزیر کا مرکز بنا
ایک جو معصوم تھا سب قاتلوں کے درمیاں
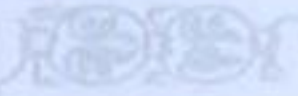
دیکھتے ہیں مگر زبان نہیں
بات بھی قابلِ بیان نہیں

پھر ستارہ مِری طرح ٹوٹا
آسماں پر کوئی نشان نہیں

جس کے دیوار و در کی قیمت ہے
وہ سرائے ہے سائبان نہیں

ایک ایسا چراغ ہے مجھ میں
جس کا اپنا کوئی مکان نہیں

پہلے تو مسئلہ ہَوا کا تھا
اب ہوا ہے تو بادبان نہیں

رزمِ توقیر میں قدم رکھیں
کُند لفظوں میں اتنی جان نہیں

جتنا دُشمن مرا ہراساں ہے
اتنا مشکل تو امتحان نہیں

میں نے اُس کا گریز دیکھا ہے، میں نے اُس کا عتاب دیکھا ہے
اس کا یہ رنگ دیکھ کر اس کو برسرِ انتخاب دیکھا ہے

یوں تو اندر ہزار موسم ہیں، دید کو بے شمار منظر ہیں
آج سرما کی دھوپ میں لیکن دشت کو بے نقاب دیکھا ہے

قریہ قریہ ترے علاقے کا، حدِ فاصل کا علم ہے مجھ کو
سبز، خوش رنگ خواب دیکھا تھا، جانتی ہوں سراب دیکھا ہے

ایک چہرے پہ تھیں تہیں کتنی، منعکس کیوں نہیں ہوا اس سے
اپنی بے چارگی کی خفت سے آئنہ آب آب دیکھا ہے

میں ان آنکھوں کو دیکھنا چاہوں، جن کی حیرت گہِ تماشا نے
شوقِ پرواز کی حدیں چُھوتا، آسماں پر حباب دیکھا ہے

اُس طرف دُھوپ کے نہ ہاتھوں نے اُسکی بوندیں کہیں اُڑالی ہوں
اپنے خطّے پہ تیرتا اکثر یوں تو میں نے سحاب دیکھا ہے

خوب سے خوب تر کی خواہش میں رُوح یک سمت ہوگئی ایسے
پھول جتنے تھے سب ہوئے اوجھل، آنکھ نے بس گلاب دیکھا ہے

عجب نہیں جو کوئی رہ نوردِ خواب لگے
سراب ہے تو مجھے کیوں نہ وہ سراب لگے

وہ ایک لمحہ جسے وقت کی ہوا نہ لگی
خزاں کی دُھوپ میں کِھلتا ہوا گلاب لگے

یہاں پہ سیلِ حوادث کے لئے کچھ بھی نہیں
کہ دل کا شہر تو پہلے ہی زیرِ آب لگے

شمار چاہتی ہے وقت کی بھی چارہ گری
کرے وہ کیا کہ جسے زخم بے حساب لگے

یہ اپنی اپنی نظر کا معاملہ ٹھہرا
کسی کو ذرّہ کسی کو وہ آفتاب لگے

شمار اُس کا بھی موجوں کی آب وتاب میں ہے
جو سطحِ آب پہ بہتا ہوا حباب لگے

شام ہوئی تو جل اُٹھا دیکھو چراغِ یاس بھی
لَو ہے تھکی تھکی ہوئی رویا ہوا اُداس بھی

درد کی تیز آندھیاں چھُو کے کسے گزر گئیں
گرد و غبار رہ گیا کچھ میرے آس پاس بھی

جب سے ندی نظر میں تھی اتنا کٹھن نہ تھا سفر
اسکے خیال سے فقط بھولے ہوئے تھے پیاس بھی

دیکھتے دیکھتے یہاں ایک مکاں تو بن گیا
کاش کسی کو ہو نصیب، آئے کسی کو راس بھی

پہلے زمینِ سنگ کو اپنے لہو سے تر کروں
پھر مجھے اُس زمین سے آئے وفا کی باس بھی

کشتی کا بادبان ہی کشتی پہ بوجھ ہو گیا
ڈوبے گی بھی تو اِس طرح اُس کو نہ تھا قیاس بھی

ایک طویل نیند سے جاگے تو دیکھتے ہیں کیا
خواب تو خواب ہے نہیں خواب کا التباس بھی

زخم کو آبرُوئے جاں کر لو
خیمۂ غم کو سائباں کر لو

اس کے چھوڑے ہوئے الاؤ کو
اپنی ہی کھوج کا نشاں کر لو

خواب کی بھی عجیب دُنیا ہے
جس کو بھی چاہو مہرباں کر لو

دونوں جانب اگر تلاطم ہے
راستہ اپنا درمیاں کر لو

درد کی ناؤ کو سنبھالا دو
اپنی وحشت کو بادباں کر لو

عکس کا انتخاب کرنا ہے
آئنہ زیرِ آسماں کر لو

بیٹھ کر آبشار کے نیچے
آبِ روشن کو بھی دُھواں کر لو

اکثر آنا، سوچ کے دَر پر دستک دینا
بھُول نہ جانا دھیان نگر پر دستک دینا

دیا جلائے رکھنا طاقِ بے خبری میں
بھُولی بسری راہگزر پر دستک دینا

نرم ہواؤ! کیوں گھبرا کر لوٹ گئی ہو
اب آؤ جو میرے گھر پر، دستک دینا

در کھُل جائے تو کرنوں کا ہالا پہنو
اے شب زادو! کفِ سحر پر دستک دینا

سارے حرف دُعاؤں کے مایوس کھڑے ہیں
آگے بڑھ کر جائے اثر پر دستک دینا

نگاہ اپنے لئے ایک معجزہ چاہے
ہر آئنے میں ترا عکس دیکھنا چاہے

بہت ہی تیز ہے خنجر کسی کے لہجے کا
مرے سلے ہوئے ہونٹوں کو کھولنا چاہے

صدا بلند ہے اتنی کہ کان پھٹتے ہیں
ہے اِذن ایسا کہ گونگا بھی بولنا چاہے

نیا مکان بنانے کے واسطے کوئی
بنی بنائی عمارت کو توڑنا چاہے

لگا ہوا ہے مری ٹوہ میں مرا دُشمن
پسِ غُبار کھڑا دل میں جھانکنا چاہے

ندی کا پاٹ بہت تنگ لگ رہا ہے اسے
ہماری ناؤ سمندر کا راستہ چاہے

ہم نے کسی کو عہدِ وفا سے رہا کیا
اپنی رگوں سے جیسے لہو کو جُدا کیا

اُس کے شکستہ وار کا بھی رکھ لیا بھرم
یہ قرض ہم نے زخم کی صورت ادا کیا

اِس میں ہماری اپنی خودی کا سوال تھا
احساں نہیں کیا ہے جو وعدہ وفا کیا

جس سمت کی ہوا ہے اُسی سمت چل پڑیں
جب کچھ نہ ہو سکا تو یہی فیصلہ کیا

عہدِ مسافرت سے وہ منسوخ ہو چکی
جس رہگزر سے تم نے مجھے آشنا کیا

اپنی شکستگی پہ وہ نادم نہیں ہوا
میری برہنہ پائی کا جس نے گلہ کیا

دُکھ جو اپنے حصے کا ہے سہنا ہو گا
ہنسنا ہوگا اور خاموش بھی رہنا ہو گا

جس سے دُنیا خوش ہو بات وہی ہے سچی
آگ کو پانی، موم کو پتھر کہنا ہو گا

دُھوپ وفا کی ساری نفرت پگھلا دے گی
برف جمے دریاؤں کو بھی بہنا ہو گا

رُت بدلی تو سارے پنچھی اُڑ جائیں گے
جھڑ جائیں گے پتے، پیڑ برہنہ ہو گا
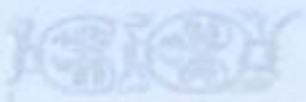
مدتوں سے خواب میں دیکھا نہیں تھا
بے رُخی کا یہ شگون اچھا نہیں تھا

دن بھی اُجلا، رات بھی مہتاب کندہ
صرف بینائی کا در کھُلتا نہیں تھا

دستکیں دیں اور پھر دَر توڑ ڈالا
گھر کا کوئی فرد بھی زندہ نہیں تھا

شہر جس میں راکھ کی اینٹیں چُنی تھیں
آگ سے محفوظ تھا، جلتا نہیں تھا

مر گیا ہے کیوں پروں کے کاٹتے ہی
اک پرندہ جو ابھی اُڑتا نہیں تھا

ذات کو گہرائیاں تو دے گیا ہے
درد کا سیلاب جو پھیلا نہیں تھا

جاؤ تم! عادی ہے دل ویرانیوں کا
اس میں پہلے بھی کوئی رہتا نہیں تھا

سفر کا استعارہ کھو گیا ہے
مسافر راستے میں سو گیا ہے

جو دُکھ اگلی رُتوں کو سینچنا تھا
اُسے وہ احتیاطاً بو گیا ہے

اگرچہ سانحہ طوفاں صفت تھا
مکدّر زندگی کو دھو گیا ہے

کوئی حرفِ صفا ایسا تو ہو گا
براہِ راست جو دل کو گیا ہے

کھڑا ہو گا تذبذب کی حدوں پر
ابھی اُٹھ کر یہاں سے جو گیا ہے

سلاخیں توڑ کر بھی کیا ملے گا
سزا کا فیصلہ تو ہو گیا ہے

ترے لشکر کا اِک انصاف پروَر
ہماری صف میں شامل ہو گیا ہے

کچھ غبارِ درد کے پھیلاؤ میں دِکھتا نہ تھا
اُس شباہت پر کسی بھی حرف کا چہرہ نہ تھا

گھر کی دیواروں کے، گر جانے کا مجھ کو خوف تھا
بے سبب طوفان میں، میں نے قدم رکھا نہ تھا

حجمِ دریا دیکھ کر کیسا تاثر لے لیا
پاؤں جو رکھا تو پانی اِس قدر گہرا نہ تھا

آبلوں نے بھی جسے پہچاننے میں دیر کی
اتنا ناہموار رستوں میں کوئی رستہ نہ تھا

چند قطروں میں سمندر کی صفت موجود تھی
آنکھ میں لکھی ہوئی تحریر نے جانا نہ تھا

شام کا پہلا ستارا ڈُوبا
اِک مسافر کا سہارا ڈُوبا

کم نگاہی نے اسے مار دیا
موج کی ضِد میں کنارا ڈُوبا

گننے نکلا تھا بھنور کے چکرّ
اس تجسّس میں بچارا ڈُوبا

کچھ تو گہرائی میں لذّت ہوگی
اس سے پوچھو جو دوبارہ ڈُوبا

اُس نے چلنے کو کہا تھا لیکن
بھیڑ میں اُس کا اشارا ڈُوبا

ایک اک نقش نے مبہوت کیا
جیسے آنکھوں میں نظارا ڈوبا

موجۂ عشق ہے طغیانی پر
پھر کوئی بخت کا مارا ڈوبا
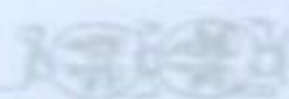
وہ بہارِ ہستی سے انتخاب کیا دیتا
بیج ہی نہ جب بویا، پھر گلاب کیا دیتا

خود ہوئی زباں بستہ اُس سے کیا گلہ کرتی
میری بے نوائی کا وہ جواب کیا دیتا

اعتماد تھا زیادہ، بات تھی کہیں چھوٹی
پوچھ کے میں کیا کرتی، وہ حساب کیا دیتا

بے طلب رہی ہوں میں، مانگتی بھی کیا اُس سے
میں تو خود اُجالا تھی، آفتاب کیا دیتا

اس میں تھا قصور اُس کا اور نہ تھی خطا میری
خام تھا جب آئینہ، آب و تاب کیا دیتا

باریاب ہو جاتی گر دُعائے آخر بھی
میری بے گناہی پر وہ عذاب کیا دیتا

آج اندر بھی روشنی کم ہے
اور دریچے کا پاٹ بھی کم ہے

کس لیے ہاتھ باندھ دوں اُس کے
کیا مجھے اپنی بے بسی کم ہے

وقت کٹتا نہیں کسی صورت
لوگ کہتے ہیں زندگی کم ہے

کوئی موسم کا رُوپ تھا شاید
آج چہرے پہ تازگی کم ہے

دُشمنی تو نہیں ہے لوگوں سے
بس ذرا اُن سے دوستی کم ہے

اپنے، غیر برابر دیکھے
سب ہاتھوں میں پتھر دیکھے

کوئی شہرِ ذات سے گزرے
صحرا بیچ سمندر دیکھے

جن سے خوف زدہ ہیں پتھر
ایسے کانچ کے پیکر دیکھے

سیپ کا کوئی مول نہیں ہے
دیکھنے والا گوہر دیکھے

ایک نظر کیا اُس کو دیکھا
دُنیا کے سب منظر دیکھے

چاہت کی بے لاگ نظر نے
عیب نہ ڈُھونڈے، جوہر دیکھے

اوروں سے منسوب ہوئے ہیں
خواب جو ہم نے اکثر دیکھے

یادوں کے آسیب سے نکلے
دل سے کہہ دو باہر دیکھے
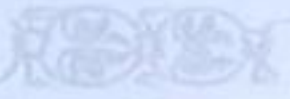
دن کی روشنی میں ہی اب چراغ جلتے ہیں
رات کے اندھیرے میں صرف داغ جلتے ہیں

ایسے اَبر سے سوچو ریگ زار کیا لیتا
یہ تو جب برستا ہے اِس میں باغ جلتے ہیں

راہ میں بچھی آنکھیں اب سُراغ ہیں میرا
جب وہ راہ چلتا ہے یہ سراغ جلتے ہیں

دل بھی جب سُلگتے ہیں ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے
انقلاب آتا ہے جب دماغ جلتے ہیں
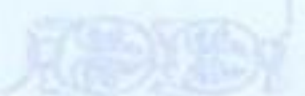
اِک دیا تھا جو دُعا کے اندر
جل رہا ہو گا خُدا کے اندر

جُرم کا بوجھ اُتر جاتا ہے
یہ جزا بھی ہے سزا کے اندر

زخم کی آنکھ کھُلی رہتی ہے
زہر ملتا ہے دوا کے اندر

چاہتیں کارِ وضو کرتی ہیں
ڈُوب کر جُوئے وفا کے اندر

رُوح کے شہر میں سنّاٹا ہے
جیسے ماتم ہو صَدا کے اندر

خشک موسم کی فراوانی بھی
ہے مری آب و ہوا کے اندر

مزا میں موت کا چکھوں اِسی حوالے سے
ترِے بغیر مگر زندگی تو کاٹ سکوں

مسافرت کے قرینے سے بے خبر بھی نہیں
مگر یہ کیا ہے کہ دل مائلِ سفر بھی نہیں

نہ جانے کیوں ہے سفر اس قدر کٹھن آخر
سحر کا ساتھ بھی ہے سمت پُر خطر بھی نہیں

جو پاس رختِ سفر تھا وہ کب کا لُٹ بھی چکا
ہمیں تو راہ میں لٹنے کا کوئی ڈر بھی نہیں

قدم سنبھال کے رکھنا کہ دشتِ ذات میں اب
بَلا کی دُھوپ ہے اور سایۂ شجر بھی نہیں

بڑا عجیب ٹھکانہ ہے اُس مسافر کا
کہ جس کا گھر بھی نہیں ہے، جو در بدر بھی نہیں

دُور رہنے کی سزا دو مُجھ کو
چاند کا نقش بنا دو مجھ کو

حرفِ اوّل کو لہو سے لکھّو
حرفِ آخر ہُوں مٹا دو مجھ کو

ایک ننھی سی کرن کیا لو گے
دُھوپ کے ساتھ مِلا دو مجھ کو

قطرۂ آب ہَوا بن جائے
یوں بکھرنے کی دُعا دو مجھ کو

سبز پتّے نہ سہی زرد سہی
کوئی موسم تو دِکھا دو مجھ کو

برف کی سِل پہ دہک اُٹھے جو
ایسا شُعلہ ہوں، ہَوا دو مجھ کو

دل کی میزان پہ تولوں تو برابر دیکھوں
پھول دیکھوں کبھی اُس ہاتھ میں پتھر دیکھوں

لا پتہ ہی نہ تہہِ آب پڑی رہ جاؤں
اپنے احساس میں اندیشۂ گوہر دیکھوں

ایک قطرہ ہوں پہنچنا ہے سمندر میں مجھے
ہاں تو پہلے کسی دریا میں اُتر کر دیکھوں

ایک تنکے سے کہیں شاخ میں خم آجائے
آشیاں کتنے کہیں ایک شجر پر دیکھوں

کیوں نہ دوں آخری پرواز کی میں داد اُسے
کس لئے اُس کے میں ٹوٹے ہوئے شہ پر دیکھوں

لاکھ رَہ میں آندھیاں ہوں، نقشِ پامل جائے گا
دل اگر سچے ہوئے تو راستہ مل جائے گا

دل میں جو شکوے رہیں گے آتشیں ہو جائیں گے
اِک شرر سے اِک شرر کا سلسلہ مل جائے گا

نفس کے دشتِ بلا میں ہم رہوں کی کیا کمی
خواہشوں سے خواہشوں کا قافلہ مل جائے گا

ایک ادنیٰ پیڑ کی موجودگی بھی ہے بہت
ننھے پھولوں کو شجر سے حوصلہ مل جائے گا

راستہ ہموار ہے تو خود چٹانیں ڈال دو
تم کو سر کرنے کی خاطر مرحلہ مل جائے گا

جھٹپٹے سے جب نکل کر روشنی میں آؤں گی
اپنی بابت کچھ نہ کچھ تو فیصلہ مل جائے گا

ہمیں خبر تھی بچانے کا اُس میں یارا نہیں
سو ہم بھی ڈوب گئے اور اُسے پکارا نہیں

خود آفتاب مری راہ کا چراغ بنے
مگر یہ بات مرے چاند کو گوارا نہیں

جو اُس میں اُتری تو طوفان ہی ملیں گے مجھے
میں جانتی ہوں کہ وہ موج ہے، کنارا نہیں

عجب فضا ہے کہ رنگِ نمودِ صبح بھی ہے
سیاہ رات نے بھی پیرہن اُتارا نہیں

وجُود جس کو کسی معتبر شجر نے دیا
ہَوا کی زَد میں بھی تنکا وہ بے سہارا نہیں

جلے گا خود بھی سحر تک مجھے بھی لَو دے گا
چراغِ شام کوئی بخت کا ستارا نہیں

دل کی بات ضروری بھی ہے
بیچ میں اِک مجبوری بھی ہے

ہے تکمیل کی خواہش بھی اور
اب تک بات ادُھوری بھی ہے

دریا کے ہیں کنارے ہم تم
قربت بھی ہے، دُوری بھی ہے

ہے دل کی آواز بھی شامل
کچھ یہ ذکر شعوری بھی ہے

اصل حقیقت رُوح کا بندھن
یوں یہ حکایت پوری بھی ہے

ہے بہت لمبی کہانی رات کی
روشنی بھی ہے نشانی رات کی

علم اپنی اہمیت کا کیا ہوا
پھر چراغوں نے نہ مانی رات کی

روشنی کو اپنے ذمّے لے لیا
مُجھ کو دے دی پاسبانی رات کی

رنگ کا پھر حُسن بے بس ہو گیا
خوشبو کہلائے گی رانی رات کی

دن کے پردے سے بھی اکثر جھانکنا
یہ شرارت ہے پرانی رات کی

کر دیا بوند کو دریا میں نے
خواب اچھا تھا جو دیکھا میں نے

کر لیا اپنے سفر کو دُشوار
ناپ کر پہلے سے رستہ میں نے

اُس پہ پرواز بھلی لگتی تھی
اِس لئے جال نہ پھینکا میں نے

گرچہ مُجرم تو ہَوا کہلاتی
پھر بھی غنچے کو نہ توڑا میں نے

سہ پہر بعد میں گھر سے نکلی
کیوں نہ دیکھا کہیں سایہ میں نے

ذات اُس کی وہ سمندر جس میں
ڈُوب کر پایا کنارہ میں نے

شہر میں سر پیٹتا بارش کا شور
رُوح میں زنجیر پا خواہش کا شور

آخری تفتیش بھی پوری ہوئی
زیرِ لب پھیلا رہا سازش کا شور

حدِ فاصل پر کھڑا تھا منتظر
پھر دَر آیا شہر میں یورش کا شور

آتشیں لاوے کی صورت گنگ ہے
اب زمینِ ضبط میں بندش کا شور

تیز دھڑکن سے مبدّل ہو گیا
آنکھ کی بے دست و پا جنبش کا شور

نواح میں بسی ہوئی مہیب بستیاں
ڈرا رہی ہیں شہر میں عجیب بستیاں

بناتے، روندتے ہیں انھیں فیصلوں کے ہاتھ
ہدف ہیں موسموں کا بدنصیب بستیاں

کسی کے مہرباں اشارے کی ہیں منتظر
اُٹھائے اپنے کاندھوں پر صلیب، بستیاں

اُچٹتی نیند سوتے ہوئے خوابِ دشت میں
نگہ میں جھلملاتی ہیں حبیب بستیاں

مسافروں کے حوصلے کا امتحان ہیں
طویل راستوں کی ہیں رقیب بستیاں

زمین تنگ ہو گئی نجات کے لئے
خلاؤں میں بنایئے مجیب بستیاں

سوچ پر جب سزا ہو، بندش ہو
کیسے موجِ طلب میں جنبش ہو

زَرد آندھی ہے سُرخ بادل ہے
پتھروں کی کہیں نہ بارش ہو

رقص میں ہے چراغ کی لَو بھی
تیرگی سے کہیں نہ سازش ہو

شب طوالت میں اور بڑھ جائے
کچھ ستاروں کی یہ نہ خواہش ہو

آگ بُجھتی نہیں ہے پانی سے
کوئی جلوہ نہ زیرِ آتش ہو

پیاس ہے اور آبِ شیریں ہے
پیالہ بھرنے کی اپنی کوشش ہو
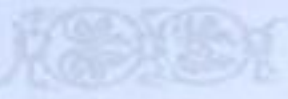
کھنچ کے آ گیا ہو جو پچھلے دور کی زَد میں
آنے والے وقتوں کا ایسا ایک لمحہ ہُوں

فصلِ دل میں نئے زخم بو جائیں گے
جانتے ہیں وہ دامن بھگو جائیں گے

راستہ دیکھتے دیکھتے ایک دِن
آنکھ لگ جائے گی لوگ سو جائیں گے

ساحلوں پر مسافر اُترنے کے بعد
مہرباں کشتیوں کو ڈبو جائیں گے

آپ اندر کے موسم کو سمجھیں گے کیا
چہرہ دیکھیں گے اور بیج بو جائیں گے

یہ کہانی جو لکھی ہے دیوار پر
لکھنے والے اسے خود ہی دھو جائیں گے

کسی نے حشر برپا کر دیا ہے
سمندر کو جو قطرہ کر دیا ہے

خوشی جو دل کی تہہ سے پھُوٹتی تھی
اُسے نقشِ سویدا کر دیا ہے

بنا کر دوست میرے چارہ گر کو
مرے زخموں کو گہرا کر دیا ہے

جہاں منزل کے میں نے بیج ڈالے
انہی کھیتوں کو رستہ کر دیا ہے

بہت تھی آئینے کی آبداری
اِسے نظروں نے میلا کر دیا ہے

میں سچائی اُسے کیسے دکھاؤں
اُسے نفرت نے اندھا کر دیا ہے

محبت کی گواہی دے کے تم نے
مجھے سب میں اکیلا کر دیا ہے

عُمر بھر یہ سوچنے کو رہ گیا
چند لفظوں میں خزینہ بہہ گیا

تیز چلنا تھا کہ تنہا ہو گئی
میرا ساتھی مجھ سے پیچھے رہ گیا

خود بھی حیراں ہے کہ یہ ٹوٹا نہیں
آئنہ عکسِ ندامت سہ گیا

وقت کی رفتار کتنی تیز ہے
جاتے جاتے کوئی مجھ سے کہہ گیا

ہنستا بستا شہر تو تھا بھی نہیں
دل کھنڈر ہی تھا، تباہی سہ گیا

چلی شب کے تعاقب میں سحر آہستہ آہستہ
مقفل ہو گئے آنکھوں کے دَر آہستہ آہستہ

ہَوا کے ساتھ ہولیں ساعتیں جو ساتھ گزری تھیں
کٹے گا اب جُدائی کا سفر آہستہ آہستہ

اُجڑ جانا کسی آباد بستی کا نہیں مشکل
مگر بستے ہیں ویرانوں میں گھر آہستہ آہستہ

اذیّت کی مجھے یہ انتہا پہ لا کے چھوڑے گا
ڈبوئے گا مری کشتی بھنور آہستہ آہستہ

تھی اتنی بھیڑ رستے میں کہ اوجھل ہو گئی منزل
چھٹے گا اب غبارِ رہگذر آہستہ آہستہ

بدلتی رُت کے ہاتھوں پھُول تو کمُلا گئے سارے
مگر کم ہو گا خوشبو کا اثر آہستہ آہستہ

مرے دل کی گواہی ایک دن میرا خُدا دے گا
حقیقت آنکھ کھولے گی مگر آہستہ آہستہ

رقص کرتی لہر پر بس مسکرانا چاہیے
پھینک کے پانی میں پتھر بھول جانا چاہیے

سر پہ چھت تو پڑ گئی ہے یہ مگر سوچا نہیں
دل کی بے سمتی کو بھی کوئی ٹھکانہ چاہیے

تلخیٔ احساس کو اپنا ہدف ملتا نہیں
جو سمو لے تیر کو، ایسا نشانہ چاہیے

منتقل ہونے سے پہلے سب در و دیوار کو
بجلیاں خود ہی گرا کر آزمانا چاہیے

ہاں نئے آئینے کا بھی عکس اُجلا ہے مگر
کیا پُرانے آئنوں کو ٹوٹ جانا چاہیے؟

کیا خبر یہ شہر میری فتح کے قابل نہ ہو
سوچ کر ہی کشتیوں کو بھی جلانا چاہیے
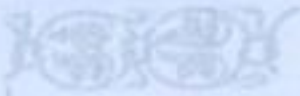
کیوں مری طرح ابھی راکھ نہیں ہو پائے
یہ مرے دوست مری آگ میں جلنے والے

زرد آندھیوں نے چھُو لیا چہرہ حیات کا
گہنا گیا لباس ہری کائنات کا

شاخیں برہنہ ہجر کی، مقدُور ہو گئیں
انجام بے ثمر تھا ترے التفات کا

اُس کی علامتوں میں فقط تیرگی نہیں
کچھ تو چراغ سے بھی تعلق ہے رات کا

کچھ دیر کے لئے تو ہوا بھی ٹھٹھک گئی
پوچھا حساب پیڑ نے جب پات پات کا

اُلجھا ہوا تھا سلسلۂ بیش و کم میں وہ
کھُل کر جواب دے نہ سکا میری بات کا

میں نے زباں کی رُو سے نیا تجربہ کیا
اپنی لُغت میں لکھا نہیں حرف مات کا

چاند نے شب کو چھوڑ دیا ہے
مان سمے کا توڑ دیا ہے

رستے کو محسوس کروں میں
اِس لئے چھالہ پھوڑ دیا ہے

میں نے اُس کے کھیت کی جانب
رُخ ندّی کا موڑ دیا ہے

آنگن کی دیوار گری تھی
گھر کا گھر کیوں چھوڑ دیا ہے

کس نے آدھے عکس کی خاطر
آئینے کو جوڑ دیا ہے

اُس کو کیسا لگتا ہو گا
جس نے وعدہ توڑ دیا ہے

رُوح کے تیرہ و سنسان جزیرے کو چلا
پھر مرے تشنہ محاذوں سے سرایت کرتا
وہ نگاہوں سے گِرا بھی تو ہتھیلی میں گِرا

کچھ رتجگے وہ دے گیا کچھ خواب دے گیا
قلب و نظر کو دولتِ کمیاب دے گیا

مجبوریوں کے ہاتھ قلم کر سکا نہ وہ
امرت پلانے والا بھی زہراب دے گیا

زرخیز ہو گئی ہے زمینِ متاعِ فن
ایسا خزینہ درد کا سیلاب دے گیا

ہر اِنتہا سے موجِ نفس آشنا ہوئی
ہستی کو لطفِ ساحل و گرداب دے گیا

تھا اعتبار اتنا کہ گُل کر دیئے چراغ
مجھ کو نویدِ صبح جو مہتاب دے گیا

شفق کا شب میں اُترنا عجیب لگتا ہے
تمھارے ہجر کا موسم قریب لگتا ہے

جو اُس کے پاس ہے، وہ بھی تو اُس کے پاس نہیں
مگر وہ شخص مجھے خوش نصیب لگتا ہے

گھٹا کے بعد کھُلی دُھوپ سے مسیحائی
کبھی کبھی تو فلک بھی طبیب لگتا ہے

کہو تو آٹھ پہر شب کی اوڑھنی رکھوں
تمھیں تو سایہ بھی میرا، رقیب لگتا ہے

عجب فریب ہے، برگد کی چھاؤں کی صورت
تمھارا، میرا، سبھی کا حبیب لگتا ہے

کتنا موہوم تھا اے دوست ارادہ تیرا
ایک جھونکے سے ہی گُل ہو گیا وعدہ تیرا

مجھ کو خدشہ بھی نہ تھا تیرے بدل جانے کا
میں نے رکھا تھا خیال اتنا زیادہ تیرا

کس لیے اوڑھ لیے گہرے اندھیرے تُو نے
مَیں نے تو کرنوں سے دھویا تھا لبادہ تیرا

وہم کا ایک بھنور اُتنا ہی پھر پھیل گیا
جتنا چاہت کا سمندر تھا کشادہ تیرا

جس کے پیروں کو تری سمت نے زنجیر کیا
اُس کے رستے سے تو ٹکرائے گا جادہ تیرا

مسئلہ اتنا تو پیچیدہ نہیں تھا لیکن
لوگ چالاک تھے اور ذہن تھا سادہ تیرا

آج بھی روشن ورخشندہ ہے
دل، شب وروز اسی زخمِ ملامت کے عوض
اپنے احساس پہ شرمندہ ہے

پُرانا منظر بدل رہا ہے
جو رہ میں جنگل تھا جل رہا ہے

نہ جانے دُکھ کتنا پھیل جائے
جو تیرے سائے میں پَل رہا ہے

بُجھے ہوئے آئنے کی خاطر
وہ غازہ چہرے پہ مَل رہا ہے

چٹان رستے میں آ گئی ہے
ہے جس کو چلنا، وہ چل رہا ہے

ہے میری کوشش بھی اس میں شامل
جو لمحۂ موت ٹل رہا ہے

میں کتنا بھاگوں گی اُس کے پیچھے
جو دسترس سے نکل رہا ہے

یہ چاند کی شب بھی آخری ہے
زمیں پہ سُورج بھی ڈھل رہا ہے

میں نے بھی ضِد میں دِیا چھوڑ دیا
زَد پہ آندھی کی جلا چھوڑ دیا

گُل کو موسم نے سزا دی کیسی
زرد پتوں میں کِھلا چھوڑ دیا

سانس لیتا ہوا انسان تھا وہ
جس کو ملبے میں پڑا چھوڑ دیا

رنگ بھرنے کا اُسے شوق نہ تھا
پھُول کاغذ پہ بنا چھوڑ دیا

رُخ ہَوا کا تھا کسی اور طرف
مَیں نے دَر پھر بھی کھُلا چھوڑ دیا

اُس کے کیا پاؤں نہیں ہیں اپنے؟
جس کو رستے میں کھڑا چھوڑ دیا

کسی نے چند قطرے لے لیے تھے
سمندر آج تک پیاسا ہے کتنا

یہ شب کے بعد اندازہ ہُوا ہے
سحر کا آئنہ دھندلا ہے کتنا

کوہ کا، دشت کا سہی، کوئی تو سلسلہ رہے
پاؤں میں آبلے رہیں آنکھ میں رتجگا رہے

یاد نہ فرد فرد ہو، دل کی زمیں نہ سرد ہو
ذہنِ رسا کے تار پر لمحوں کا رابطہ رہے

شب کی حکایتوں میں ہوا ایسا بھی کوئی سانحہ
جس میں چراغ گُل نہ ہو، سہمی ہوئی ہَوا رہے

ایسا نہ ہو کہ اَبر تو برسے مری زمین پر
پانی مگر نہ جذب ہو، سطح پہ ہی کھڑا رہے

ختم ہُوا تھا سلسلہ جس پہ ہمارے ساتھ کا
وادیٔ ذات میں وہی حرف نہ گونجتا رہے

خوشی ہے کیا اور رنج کیا ہے
اِک ابتدا ہے اِک انتہا ہے

نہ تھم رہا ہے نہ بڑھ رہا ہے
نہ جانے کیسا یہ زلزلہ ہے

طریقِ اظہار چھین کر بھی
وفورِ احساس دے دیا ہے

نہ گھر گرے گا نہ گھر بسے گا
یہ گھر کے معمار کی سزا ہے

حساب میں جو ہَوا کے سیاہ بخت ہوئی
وہ شاخ ٹوٹ کے پھر سے نیا درخت ہوئی

پھر اِس لیے کہ مرا حوصلہ نہ پَست ہُوا
فلک تو آن ِگرا تھا، زمیں بھی سخت ہوئی

مٹھاس گھُلتی گئی زہر پھیلتا ہی گیا
نشان چہرے پہ اُبھرے، نظر کرخت ہوئی

مَیں ساتھ دیتی رہی کوئی فیض پاتا رہا
مری حیات کسی دُوسرے کا بخت ہوئی

ہمیشہ مُجھ پہ اُسی کی دُعا کا رنگ ِکھلا
وہ جس کی چھاؤں مری زندگی کا رخت ہوئی

اِک یہ بھی فیصلہ ہے بہاروں کے باب میں
پُھولوں کے آس پاس کوئی تتلیاں نہ ہوں

گھر سے چلیں تو کوئی دُعا اوڑھ کر چلیں
خالی ہوں کان، ہاتھ میں بھی چوڑیاں نہ ہوں

تھا جو یادوں کا خزانہ مرے گھر پر رکھا
اُس کی خاطر نہ کبھی پاؤں سفر پر رکھا

پوچھتا ہے یہ ترے شام وسحر کی بابت
یاد کا لمحہ جو ہے دیدۂ تر پر رکھا

ایک پَل ہوگا فقط دید کا، جس کی خاطر
مَیں نے صدیوں کو تری راہگذر پر رکھا

توڑ دے یا اسے خورشید کا ہمسر کر دے
ایک شیشہ ہُوں ترے دستِ ہُنر پر رکھا

شام سے پہلے بُجھایا مرا سُورج اُس نے
اور الزام یہ آئینِ سحر پر رکھا

کتنی سادہ ہے تحریرِ دل
ایک ہی نام پر مشتمل

اپنی ہیئت بدل لیتے ہیں
زخم ہوتے نہیں مندمل

سیلِ احساس کو روک لو
بن گئے ہیں وہ پتھر کی سِل

شہرِ وحشت کی آب و ہوا
ایک ہی کیفیت مُستقل

مجھ کو ہنستا ہُوا دیکھ کر
لوگ کیوں ہو گئے مضمحل

یہ توہّم پرستی تو ہے
پھر بھی دیکھوں میں ہونٹوں کا تِل

دل کا بیکار سا مشورہ
ہو سکے تو کبھی اُن سے مِل

غم بانٹنے کو آئے، مرے ساتھ رو گئے
کچھ داغ اور دے گئے، کچھ داغ دھو گئے

آپس میں آس پاس کی سمتیں اُلجھ گئیں
رستہ دکھانے والے مجھے خود ہی کھو گئے

پہلے گلوں میں مجھ کو ملایا گلاب سے
پھر سارے زاویوں سے وہ کانٹے چبھو گئے

ہم نے سُنا ہے وہ تو سمندر سے دُور تھی
لہروں کے خشک ہاتھ جو بستی ڈبو گئے

یوں تو شجر کے سائے میں تاثیر کچھ نہ تھی
ہم ہی تھکے ہوئے تھے، پڑے اور سو گئے

عجیب ہو گیا کسی کا ساتھ بھی
چراغ بھی تھکا ہُوا ہے، رات بھی

سوال راستے میں ہی کھڑا رہا
جواب بن سکی نہ کوئی بات بھی

خزاں نظر ہَوا کے ہاتھ لگ گئے
گرے ہیں ٹہنیوں سے سبز پات بھی

یہ بات کیا کہ آج تک نہیں رہا
تمھارے ہاتھ میں کسی کا ہاتھ بھی

یہی ثبوت ہے مرے خلوص کا
نیا اُفق دکھا رہی ہے مات بھی

مرے وجود ہی میں بُت شکن بھی ہے
مرے وجود ہی میں سومنات بھی

سفرِ آب پہ کشتی کو روانہ کر کے
کفِ ساحل نے مسافر کو ڈبونا چاہا

اِک سناّٹا جاتا ہے اور اِک سناّٹا آتا ہے
پھر بھی یہ دیوار و دَر کا ڈھانچہ گھر کہلاتا ہے

دھرتی اپنی نمی سے اپنے دامن کو بھر لیتی ہے
ہَوا کا ساتھی کالا بادل بِن ٹھہرے اُڑ جاتا ہے

اسی لیے کہ ریت پہ تو مٹنے کا خدشہ رہ جاتا
ایک مسافر پتھر پر پیروں کے نقش بناتا ہے

میرے اندر کے سونے کو شاید دیکھ نہیں سکتا
نقلی دھاتوں کے زیور جو شخص مجھے پہناتا ہے

کھُلنا مشکل ہو جاتا ہے، گرہیں کاٹی جاتی ہیں
جب کوئی رشتوں کے اُلجھے دھاگوں کو سُلجھاتا ہے

ذرا سی دیر کو منظر بہت مکمل تھا
پھر اُس کے بعد مرے راستے میں جنگل تھا

وہ اُڑتے اُڑتے بھی چھاؤں تو دے گیا ہوگا
تہی تھا آب سے، برسا ہُوا جو بادل تھا

دل اپنے وصف میں صحرا بھی تھا سمندر بھی
اُلجھ گیا تو پھر اِک بے کنار دلدل تھا

وہ مثلِ آب تھا شعلوں سے ڈر گیا لیکن
صفت نہ اپنی ہی جانا، عجیب پاگل تھا

بکھر گیا تو اِک عالم کو وہ دکھائی دیا
ابھی تلک جو ستارہ نظر سے اوجھل تھا

کھِلتے پھُولوں کی رِدا ہو جائے
اتنی حساس ہَوا ہو جائے

مانگتے ہاتھ پہ کلیاں رکھ دے
اِتنا مجبور خُدا ہو جائے

دل میں اِک ٹیس سی بن جاتا ہے
جس تعلق کو بقا ہو جائے

میں خزاؤں کو لہو دے آؤں
پھر اگر پیڑ ہرا ہو جائے

گرد جھڑ جائے مرے بالوں سے
اُس کا بھی چہرہ نیا ہو جائے

یاد رکھے مری تنہائی کو
چاہے وہ مُجھ سے جُدا ہو جائے

وہ جو طوفاں میں لگا تھا کبھی ساحل کی طرح
چُھٹتا جاتا ہے بچھڑتی ہوئی منزل کی طرح

ایک قطرہ ہوں مگر نکلی ہوں دریا کی طرف
آب بستہ نہ ہوئی میں کسی بُزدل کی طرح

مری شرکت تو برابر ہے سرِ جُرمِ نظر
مُجھ کو دی جائے سزا بھی مرے قاتل کی طرح

دائرے کتنے ہی بن جائیں پہ مرکز ہے وہی
اپنے اندر کسی پابندِ سلاسل کی طرح

یہ ضروری تو نہیں ہے کہ وہ دُشمن ہو مرا
نظر آتا ہے اگر مدِّ مقابل کی طرح

مری آنکھوں کے آئینے میں تصویرِ ہُنر دیکھو
ستاروں کا سفر ہمراہ میرے رات بھر دیکھو

نہ یہ پوچھا کرو میں کس لیے خاموش رہتی ہوں
کبھی میری خموشی کے معانی جان کر دیکھو

وہ خوشیاں بانٹنے والا تو اب دُکھ بھی نہیں دیتا
مرا محسن ہے مجھ سے آج کتنا بے خبر دیکھو

یہاں اُس کی بھی یادوں اور ارادوں کے دفینے ہیں
یہیں پر بیٹھ کر تا عُمر اُس کی رہگذر دیکھو

اسیری میں اُڑانوں کا خیال آتا رہا مجھ کو
مرے پر نوچنے والو مرا عزمِ سفر دیکھو

ایک ہی حلقۂ زنجیر میں رہنا ہو گا
رُوح کو جسم کی تعزیر میں رہنا ہو گا

حکم ہے زیست کے سفّاک تقاضوں کا یہی
خواب کو حسرتِ تعبیر میں رہنا ہو گا

متّصِل، دیکھ، کئی اور بھی گھر ہیں تجھ سے
دل، تجھے کاوشِ تعمیر میں رہنا ہو گا

تیری چاہت میں تغافل کے جو لمحے ٹھہرے
اُن کو بھی یاد کی تصویر میں رہنا ہو گا

نکلی گہنائی ہوئی دُھوپ تو یہ بھید کُھلا
صبح کو شام کی تزویر میں رہنا ہو گا

جس دن وہ مجھ سے اُلجھا تھا
سارے بندھن بھُول گیا تھا

میں نے آنکھیں موند کے دیکھا
وہ بھی مُجھ کو دیکھ رہا تھا

میں اُس کی باتیں کرتی تھی
وہ اپنی باتیں کرتا تھا

اب کہنے کو جی ہی نہ چاہے
وہ کیا کیا مجھ سے کہتا تھا

وہ جھوٹی باتوں کا عادی
سچّے لوگوں سے ڈرتا تھا

اپنے اُوپر خول چڑھا کر
اپنے جیسوں سے ملتا تھا

کچھ احساس کی مایا کم تھی
کچھ کانوں کا بھی کچّا تھا

ٹوٹنے سے پہلے اِک تارا
کتنی شدّت سے چمکا تھا

چاروں جانب دریا جس کے
اُس بستی میں قحط پڑا تھا

زرد ہُوا، کملایا چہرہ
اُس کی آنکھوں سے کُھلتا تھا

اُس موسم کا عکس دکھاؤ
جس موسم میں باغ ہرا تھا

آخر کس کے حصے آتا
دِل تھے دو اور ایک دیا تھا

وہی کتھا تھی، وہی صحیفہ
لکھنے والا ہاتھ نیا تھا

میں سرِ بزمِ وفا نازشِ محفل ٹھہروں
صورتِ شوق جلوں، تیرے مقابل ٹھہروں

زہر بکھرے کہ ترے حرف سے تریاق بنے
ہر کنایے میں تری بات کا حاصل ٹھہروں

زخم دیکھوں تو مسیحائی کا الزام لگے
پھیر کر آنکھ پلٹ جاؤں تو قاتل ٹھہروں

میرے اطراف چٹانیں ہوں گھنا جنگل ہو
جس کا رستہ ہی نہ ہو کوئی وہ منزل ٹھہروں

جس سے ٹکرا کے پلٹ جائے سمندر ہر بار
جس پہ اُترے نہ کبھی کوئی وہ ساحل ٹھہروں

حَدوں کو بھُول جانا چاہتی ہوں
خلاؤں میں ٹھکانہ چاہتی ہوں

مناظر گھول کر آسُودگی کے
میں آنکھوں پر لگانا چاہتی ہوں

میں لہجے گوندھ کر میٹھے سُروں کے
سماعت کو سُنانا چاہتی ہوں

جو دریا تہہ تلک سُوکھا ہوا ہے
میں اُس میں ڈُوب جانا چاہتی ہوں

لکھا ہے ریت پر پیغام میں نے
وہاں پہرا بٹھانا چاہتی ہوں

وہ جس کے دَر مقفّل ہو گئے ہیں
اُسی گھر کو بسانا چاہتی ہوں

کسی کی بے رُخی کا لمحہ لمحہ
میں قصداً بھُول جانا چاہتی ہوں

بند آنکھوں میں بہتے ہوئے خواب تھے
نیند ٹوٹی تو دریا وہ بے آب تھے

ایک سُورج بُجھا اور سب بُجھ گئے
میرے ماتھے پہ کتنے ہی مہتاب تھے

لوگ چاہت میں اِک دُوسرے کے لئے
جتنے بے تاب تھے اُتنے کمیاب تھے

سبز ہوتی نہ فصلِ مہ و سال کیوں
کھیت آنکھوں کے پانی سے سیراب تھے

برق کی روشنی ہی دکھاتا فلک
چاند، سُورج، ستارے تو نایاب تھے

سلسلہ فہم کا منقطع ہو گیا
بند کی اوٹ یادوں کے سیلاب تھے
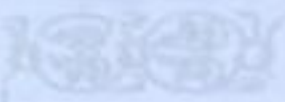
بہت نم ہے زمیں دیکھو کہیں پودے نہ جل جائیں
کہ پیاسے کو بقدرِ ظرف ہی پانی بھی دیتے ہیں
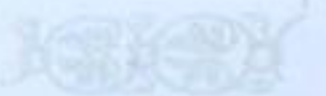
شیرازۂ دِل میرا بکھر جائے تو اچھا
احسان کسی اور کے سر جائے تو اچھا

جب گاؤں گھروندوں نے سپر ڈال ہی دی ہے
چڑھتا ہُوا دریا بھی اُتر جائے تو اچھا

کچھ اِس سے زیادہ نہ کرو عرضِ تمنّا
اب زخمِ طلب دید سے بھر جائے تو اچھا

مانا کہ تمھیں راہ کمک دیتی رہے گی
کچھ ساتھ مگر زادِ سفر جائے تو اچھا

بستی میں پہنچ کر یہ کہیں یاد نہ آئے
صحرا میں بھی کچھ وقت گذر جائے تو اچھا

میں ہُوں کہ تواضع کا ہُنر بھول گئی ہُوں
مہمان کسی اور کے گھر جائے تو اچھا

اچھا ہے میرا گھر بھی
دیواریں بھی ہیں دَر بھی

رات گئے خاموشی سے
مجھ کو لگتا ہے ڈر بھی

پیاس تھی میٹھے پانی کی
تھا لاچار سمندر بھی

آنکھیں کیوں بھر دیتا ہے
اتنا پیارا منظر بھی

اُس کو پانی لگتا ہے
میری آنکھ کا گوہر بھی

توڑ کے اِک آئینے کو
ڈرا ہُوا ہے پتھر بھی

دستک دیئے جاؤ کوئی در وا نہ کروں گی
دیکھو مرا دل عام گزرگاہ نہیں ہے
یہ گھر ہے مرا میں اسے رستہ نہ کروں گی

کون سی ساعت دکھائے گی گھروں کا سلسلہ
ختم ہوتا ہی نہیں ہے پتھروں کا سلسلہ

رُوح کے اندر نہیں اُترا تو پھر کس کام کا
سبز، پیلے اور نیلے منظروں کا سلسلہ

ناتواں پرواز تھی پھر بھی پرندے اُڑ گئے
دیکھتا ہی رہ گیا جھڑتے پروں کا سلسلہ

پیچھے مُڑ کر راستہ دیکھا تو آئے گا نظر
جا بجا درجہ بہ درجہ مقبروں کا سلسلہ

ق

بھیڑ میں سارے ہی چہرے ایک سے لگنے لگے
اِک سمندر کی طرح پھیلا سَروں کا سلسلہ

اور پھر کچھ دیر میں منظر کا حصہ بن گیا
میلی، بوسیدہ پُرانی چادروں کا سلسلہ

حدوں کی بات فصیل و قفس کی بات نہیں
یہاں سے کوچ ہمارے ہی بس کی بات نہیں

یہ ایک دو کا نہیں، شہر بھر کا ماتم ہے
چمن کی موت ہے یہ، خار و خس کی بات نہیں

مجھے قبول نہیں اِس کی آبرُو ریزی
یہ صدقِ دل کی ہے، حرص و ہوس کی بات نہیں

خوشا کہ شب تو مری ہے، اگرچہ چاند ابھی
مرے نصیب مری دسترس کی بات نہیں

قتل کی سازش تھی تیرے لہجۂ سفّاک میں
تیز خنجر جا لگا میری رگِ ادراک میں

پہلے پہلے رونے والے وہ بھی آئے گا مقام
جب سمندر جم رہیں گے دیدۂ نمناک میں

کس طرح کاوش کی لذّت کا ہو اندازہ اُسے
جس کو موتی مل گیا ہے ایک مُٹھی خاک میں

لَوٹ جانے کے ارادے سے یہاں آیا تھا وہ
کچھ اُلجھ کر رہ گیا حالات کے پیچاک میں

اک سفر کی ابتدا تھی اک اشارہ آنکھ کا
داستاں کی داستاں تھی جُنبشِ بیباک میں

میں لڑکھڑائی جہاں بھی، مرے قریب رہا
ترا خیال مری ذات کا منیب رہا

نہ اُس کا نام، نہ تھی ہاتھ پر لکیر کوئی
بڑے طویل سفر کا جو ہم نصیب رہا

سپاٹ چہرے پہ لکھی ہوئی کہانی ہُوا
سو اپنی طرز کا وہ منفرد ادیب رہا

رہی ہے جنگ ضروری مفاہمت کے لئے
کسی سے ربط کا بھی سلسلہ عجیب رہا

حصارِ ہجر میں دُنیا سے بے نیاز رہی
ترے قیام کا لمحہ مرا حبیب رہا

بس اتنا یاد ہے پہلا قدم پڑا تھا کہیں
پھر اُس کے بعد بہت راستہ مہیب رہا

کبھی چھلکائے ہیں آنسو خوشی میں
کبھی غم کو اُڑایا ہے ہنسی میں

بضد ہو تم کہ میں مانوں تمھاری
کہو کیا لطف ہے اِس سرکشی میں

نگاہوں سے تکلّم ہو رہا ہے
قیامت کا سماں ہے خامشی میں

ہُوئی ہے آگ سے جب سے رفاقت
دُھواں پھیلا ہُوا ہے زندگی میں

مجھے احساس کی حد پر بلا کے
بہت کچھ کہہ گیا وہ بے حسی میں

بہت پھیکا لگا ہے چاند مجھ کو
اُسے دیکھا ہے جب بھی روشنی میں

مجھے اُس کے نہ آنے کا یقیں تھا
پُکارا تھا اُسے جب بے بسی میں

تُم نے دُکھ اس قدر دیا مُجھ کو
بے یقینی سے بھر دیا مجھ کو

ایک سُنسان سے جزیرے پر
ایک پیارا سا گھر دیا مجھ کو

راستہ دو قدم بتایا اور
کتنا زادِ سفر دیا مجھ کو

میری صُورت بگاڑ دی اُس نے
آئنہ بے ہُنر دیا مجھ کو

قتل کر کے مرے گواہوں کو
اُس نے خاموش کر دیا مجھ کو

بن گئے پُھول باعثِ رونق
پیڑ جو بے ثمر دیا مجھ کو

چاندنی چاند کی شہادت ہے
اور وہی اس کی دسترس میں نہیں
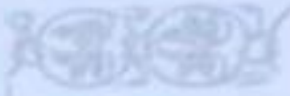
مانا کہ بے کنار سمندر تھے راہ میں
ساحل بھی جھلملاتے رہے ہیں نگاہ میں

میرا بھی ایک نام ہے میرا بھی اِک مقام
یہ بُھول ہی گئی تھی مگر اُس کی چاہ میں

اِک پیکرِ حیات ہے، اِک طالبِ حیات
اتنا ہی فرق آیا نظر مہر و ماہ میں

انساں کے ساتھ رہتا ہے اُس کا ضمیر بھی
لذت نہیں ہے ایسی بھی کوئی گناہ میں

خواہش ہے دُھوپ کا بھی کبھی ذائقہ چکھوں
اِک عُمر سے رہی ہوں شجر کی پناہ میں

گھر کے گھر کا پتہ نہیں چلتا
اِس نگر کا پتہ نہیں چلتا

آئنے انتظار کرتے ہیں
شیشہ گر کا پتہ نہیں چلتا

جسم و جاں سے جو ماورا دیکھے
اُس نظر کا پتہ نہیں چلتا

کس کے ہمراہ چل رہا ہے وہ
ہمسفر کا پتہ نہیں چلتا

آدمی کھو گیا خلاؤں میں
بحر و بر کا پتہ نہیں چلتا
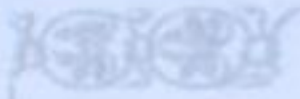
اِک خبر شہر بھر میں پھیلی ہے
فتنہ گر کا پتہ نہیں چلتا

میں نے خود ہی بُجھا دیا ہوگا
جس شرر کا پتہ نہیں چلتا

ایک ہی پر تھا بچا اور وہی ٹوٹ گیا
طائرِ جاں سے اُڑانوں کا نگر چھوٹ گیا

روشنی اوڑھ کے بے خوف و خطر سویا تھا
جس مسافر کو اندھیرے میں کوئی لُوٹ گیا

کتنی چھوٹی سی تعلق کی کہانی ہو گی
آبلہ راہ کو چھوتے ہی اگر پھوٹ گیا

کچھ تو طغیانی نے کھینچا اسے اپنی جانب
کفِ ساحل سے بھی کشتی کا کڑا چُھوٹ گیا

مسلسل ایک ہی تصویر چشمِ تر میں رہی
چراغ بُجھ بھی گیا روشنی سفر میں رہی

رہِ حیات کی ہر کشمکش پہ بھاری ہے
وہ بے کلی جو ترے عہدِ مختصر میں رہی

خوشی کے دور تو مہماں تھے آتے جاتے رہے
اُداسی تھی کہ ہمیشہ ہمارے گھر میں رہی

ہمارے نام کی حقدار کس طرح ٹھہرے
وہ زندگی جو مسلسل ترے اثر میں رہی

نئی اُڑان کا رستہ دکھا رہی ہے ہمیں
وہ گرد پچھلے سفر کی جو بال و پر میں رہی

تنہا سفر کروں گی اگر ہم سفر نہیں
پھر راستے میں کیا ہو مجھے اس کا ڈر نہیں

دل تو کھڑا ہُوا ہے سرِ روزنِ اُمید
کب سے اگرچہ تازہ ہوا کا گُزر نہیں

جس پہ کِھلی کسی کے لہُو کی بہار ہو
ایسی کوئی لکیر مرے ہاتھ پر نہیں

کس کس کے آشیانوں کو برباد کر گئیں
جن آندھیوں کے راستے میں میرا گھر نہیں

ہاں بھُوک بن گئی ہے مرے شہر کا نصیب
گرچہ کسی پہ بند کسی کا بھی در نہیں

اپنے ہی شاہکار پر تنقید کر سکے
کیا ایسا خود شناس کوئی نقش گر نہیں؟

ایک احساس کے دیرینہ اثر سے نکلیں
کیوں کڑی دُھوپ میں ہم اپنے ہی گھر سے نکلیں

خوف کی آڑ لئے پُشت سے جو وار کریں
جیت کر لوگ وہ کیا مات کے ڈر سے نکلیں

یہ مسافر ہیں کسی راہ کے ٹھکرائے ہوئے
لَوٹ آئے ہیں تو احساسِ سفر سے نکلیں

اب ارادہ ہے اِسی بھید کی گلیاں گُھومیں
ساحلِ درد کی خاطر نہ بھنور سے نکلیں

سوچ کی باہیں ترے دوشِ اُفق تک پہنچیں
اب اُڑانوں کی یہ خواہش ہے کہ پَر سے نکلیں

اپنے اشکوں سے کہو چشمِ قلم سے برسیں
محبسِ جاں کے کسی ایک ہی دَر سے نکلیں

یوں نہ کانٹوں میں شب و روز پروئی جاؤں
سیلِ احساس کی خوشبو میں بھگوئی جاؤں

یاد آؤں کسی لمحے کو بڑی شدّت سے
میں کسی آنکھ میں چمکوں کبھی روئی جاؤں

کشتِ ویراں میں محبت کی کہانی لکھوں
صورتِ حرفِ وفا ریت میں بوئی جاؤں

کبھی تتلی کی طرح پنکھڑی چوموں تو کبھی
گوہرِ نم کی طرح گُل میں سموئی جاؤں

ماسوا ایک، کوئی اور نہ بھائے مُجھ پر
ایک ہی رنگ میں ہر بار ڈبوئی جاؤں

ایک اعزاز کی صورت مجھے پائے کوئی
اور اعزاز کی صورت ہی میں کھوئی جاؤں

گھر کی چھت پر کھیلتی برسات کی آواز تھی
ہاتھ پکڑے ساتھ دیتی رات کی آواز تھی

میرے ہونٹوں پر کھڑی پہرا دیا کرتی تھی جو
بات کو زنجیر کرتی ذات کی آواز تھی

وقت کے حیرت کدے میں بولتی رہتی تھی جو
بے یقینی کی علامت ، مات کی آواز تھی

گونجتی جو رُوح کی خلوت سرا میں بارہا
میری سرگوشی کی، اُس کی بات کی آواز تھی

میرے اندر کی خموشی بولتی تھی آنکھ سے
رقص کو ڈھولک سُناتی، ہات کی آواز تھی

حرف سارے اُس کے تابع جھومتے یا ڈولتے
لَے بدلتی گیت میں حالات کی آواز تھی

برنگِ سُرخ چہرہ کرب کا، تصویر ہوتا ہے
لہُو کے آبشاروں سے ہُنر تعمیر ہوتا ہے

نِگہ انسان کی بس ایک حصہ جذب کرتی ہے
بہت کچھ آسماں پر رات دن تحریر ہوتا ہے

رسائی کا ذریعہ ہی نہ ہو تو فیصلہ کیسا
جہاں پر راستہ ہو، گھر وہیں تعمیر ہوتا ہے

محبت اور نفرت کی گواہی ایک ہوتی ہے
کہ دونوں ہی میں تنکا آنکھ کو شہتیر ہوتا ہے

ہر اِک کو اپنی اپنی چھت کے نیچے نیند آتی ہے
بہت چھوٹا سا گھر بھی صورتِ جاگیر ہوتا ہے

پختہ یقین تھا جسے صبحِ مآل پر
اب چونک سا گیا ہے سفر کے سوال پر

بارش کے بعد مہرباں بادل کہاں گیا
دھرتی بہت اُداس ہے زخمِ وصال پر

دستِ شفا تو زخمِ مسیحائی دے گیا
اب کس کا نام لکھوں رہِ اندمال پر

موسم کی آنکھ سے تو توقع نہ تھی انہیں
کلیوں کو اعتبار تھا اپنے جمال پر

اِک نقش ہے جو مٹ کے دوبارہ بنا کِیا
اِک پُھول ٹوٹ کر بھی مہکتا ہے ڈال پر

صحرا میں چلنے والوں کو مژدہ سنایا جائے
سُورج کی روشنی ہے اب اپنے زوال پر

دَر بند مکانوں کے مکیں اور کیا کرتے
دُنیا کو دیکھ آئے ہیں رَخشِ خیال پر

اپنے ربّ سے

بانجھ بے خواب نظر
دیدۂ پر آب
گراں گوش سماعت
لبِ سربستہ وحیران
حرف، معنی کے تعلق سے پشیمان
ذہن پژمردہ و دل افسردہ
زرد بیمار مسافت کی تھکن
بارِ سخن---
نقشِ بے داد کو پستی سے اُٹھانے والے
دستِ بے مایہ کو آئینہ دکھانے والے
زندگی کرنے کا احساس دلانے والے
مضطرب رُوح کو سینے سے لگانے والے

اسمِ احمدؐ کا دِیا دل میں جلانے والے
تُجھ کو اس نام کی حُرمت کی قسم
اپنے محبوبؐ کی عظمت کی قسم
حشر کے روز محبت کی گواہی دینا!

بہت دن ہوئے ''پسِ آئینہ'' کی نظموں غزلوں کے ذریعہ یاسمین حمید کے کلام سے میری ملاقات ہوئی تھی تو ایک خوشگوار تعجب اور فرحت کا احساس ہوا تھا۔ ہمارے زمانے میں عورت شعراء کے ساتھ ایک نئی مشکل یہ ہے کہ پڑھنے والے، بلکہ نقاد، بار بار پوچھتے ہیں: عورت کی حیثیت سے وہ دنیا کو کیسا دیکھتی ہے اور دُنیا کے بارے میں کیا سوچتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ یہ سوال برجا ہے۔ لیکن کسی شاعر کے بارے میں پہلا سوال یہ ہونا چاہیے کہ وہ شاعر کیسا ہے؟ اور یہ سوال بلالحاظ مذہب وجنس پوچھا جانا چاہیے۔ آج کی بہت سی عورت شاعروں کو میں اس کشمکش میں غیر شعوری طور پر مبتلا دیکھتا ہوں کہ وہ ''اپنا پیغام'' اپنے کلام میں ضرور داخل کر دیں، تاکہ کسی کو شک نہ ہو کہ اُنھوں نے اپنے تانیثی تشخص کے ساتھ بے انصافی تو نہیں کی ہے؟ یاسمین حمید کا پہلا مجموعہ جو میرے ہاتھ لگا اس نے مجھے کسی شک میں نہ رکھا تھا کہ یہ حسیت، یہ خاموش، متین لیکن درد میں رچا ہوا لہجہ عورت ہی کا ہو سکتا ہے۔ لیکن ذرا زیادہ غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس شاعر کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنی تانیثی حسیت کو بے پردہ نہیں کرتی۔ اس کی شاعری پر ''عورت پن'' کا خود کار ٹھپہ نہیں ہے۔ وہ عورت بھی ہے اور دُکھ اُٹھاتے ہوئے، اُمید وبیم سے لڑتے ہوئے، خوف اور دہشت اور عالم گیر تاجرانہ سماج کے دباؤ میں جینے کی کوشش کرتے ہوئے جدید انسان کی بھی ترجمان ہے۔

''پسِ آئینہ'' کے بعد میں نے یاسمین حمید کے دو مجموعے اور دیکھے ہیں اور رسالوں میں بھی ان کا کلام گاہے گاہے دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے۔ وقت کے آگے بڑھنے کے ساتھ یاسمین حمید کے کلام میں بعض نئی جہتیں پیدا ہوگئی ہیں، مثلاً سیاست ان کے لیے اب ایسی حقیقت کا روپ اختیار کر چکی ہے جو گندے دُھوئیں کی طرح عالمِ انسانی پر محیط ہے۔ لیکن سیاست ان کے یہاں موضوعِ سخن نہیں، بہانۂ سخن ہے، اور یہی بات ان کی شاعرانہ مہارت اور استعاراتی نگاہ کی دلیل ہے۔ نثری نظم کے پردے میں اب یاسمین حمید کی برہمی اور تلخی اور محزونی کچھ زیادہ نمایاں ہے اور بعض اوقات خوف پیدا کرتی ہے کہ اس بظاہر خاموشی پسند شاعر کے دل میں کتنے تلاطم اُبل رہے ہیں۔ نظم میں، اور خاص کر نثری نظم میں، ابہام کی بھی گھٹائیں پُرلطف تاثر پیدا کرتی ہیں۔ پڑھنے والا دیر تک ان نظموں میں معنی کی تہوں سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ غزلوں میں سادہ گوئی اور تازہ گوئی پہلے ہی کی طرح ہے۔ تانیثی جہت اب بھی پہلے کی طرح موجود لیکن زیادہ تر زیرِ زمیں ہے۔ ''پسِ آئینہ'' کا پہلا شعر ہے:

کنارے پر کھڑی ہوں اور کنارے ڈھونڈتی ہوں
سحر کی روشنی میں چاند تارے ڈھونڈتی ہوں

یہ رومانی تلاش بھی ہے اور آج کی زندگی کی محزونی اور نارسائی بھی۔ ''آدھا دن اور آدھی رات'' کا آخری شعر حسبِ ذیل ہے:

سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ مجھ کو میرا خالق
بنانا چاہتا ہے یا مٹانا چاہتا ہے

یہاں رومانی تلاش نے بالآخر شاعر کا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب ہر طرف استفسار اور رنجیدگی اور تھوڑی سی برہمی ہے۔ یہ انتہائیں نہیں، منزلیں ہیں، بہت بلند منزلیں۔ یاسمین حمید ہمارے شکریے کی حقدار ہیں کہ انھوں نے جدید شاعری کو ایک نیا وقار بخشا ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد، ستمبر ۲۰۰۶ء